Regd. L. No. 7243

Phone 330800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1983

اس پرچہ میں

نظام — صدارتی یا پارلیمانی ؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون: ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۳ تین روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ "
شمارہ ۱۰	اکتوبر ۱۹۸۳ء	جلد ۳۶

فہرست

۱۔ لمعات .. .. .. تحریکِ نظامِ مصطفیٰ (۱۹۷۷ء) پردہ اُٹھ جانے کے بعد! ۲
۲۔ قرآنی درس کے اعلانات ۷
۳۔ (کالعدم) جماعتِ اسلامی اور علماء۔ (قسط ۲) شاہد عادل ۹
۴۔ مقدمہ بہاولپور ۱۹۳۵ء (ختمِ نبوت کے متعلق) .. .. محترم پرویز صاحب ۲۲
۵۔ نگۂ بازگشت (رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل قسط ۲) مرتبہ: محترم محمد اسلام صاحب .. ۲۵
۶۔ باب المراسلات ۴۰
۱۔ نظامِ حکومت صدارتی ہوگا یا پارلیمانی؟
۲۔ صدر کو ویٹو کا حق ہوگا یا نہیں!
۷۔ قراردادِ مقاصد (۱۹۴۹ء)۔ اسے کیوں پاس کرایا گیا تھا؟ ۵۴

ایڈیٹر: محمد خلیل: ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵۔بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ۔ لاہور۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

وہ شخص جو دین کو سیاسی پراپیگنڈہ کا پردہ بناتا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے۔
(علامہ اقبالؒ بحوالہ انوار اقبال۔ مرتبہ: بشیر احمد ڈار ص ۱۶۸)

آجکل "اسلام پسند" جماعتوں میں پھر سے اتحاد قائم کرنے کی کوششیں زور پر ہیں۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، ان کا مرکز (کالعدم) جماعت اسلامی ہے۔ اس سلسلہ میں، اسی جماعت کا آرگن، ترجمان القرآن، اپنی ستمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت کے اداریہ میں رقمطراز ہے:۔

اتحاد کی مبارک مساعی کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ ضرور سوچئے کہ پہلے جو اتحاد بنا تھا وہ کیوں ٹوٹا! (یعنی ۱۹۷۷ء کا متحدہ قومی محاذ طلوع اسلام۔ اس معاملہ میں ایک دوسرے پر الزامات لگانے کے بجائے اصولاً ان وجوہ و اسباب کو متعین کیجئے جو خاتمۂ اتحاد کا باعث بنے اور لوگوں میں آہستہ آہستہ یہ احساس پروان چڑھتا گیا کہ محبِ اسلام وطن جماعتوں اور ان کے لیڈروں میں اتحاد کو آگے بڑھانے اور اسے بدلتے حالات میں قائم رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں، یا یہ کہ سارا تماشا حصولِ اقتدار کا ہے، دین اصلاً مقصود نہیں ہے۔ اس بنا پر بہت سے لوگ سرے سے اس بات ہی کے مخالف بن گئے ہیں کہ ان جماعتوں کو اتحاد قائم کرنا چاہیئے۔ (ص ۴)

۱۹۷۷ء کا اتحاد اور اس کی برپا کردہ تحریک ابھی کل کی بات ہے، اور اس کے "نظام مصطفیٰؐ" کے فلک بوس نعرے اور فضا شگاف غلغلوں کی صدائے بازگشت ابھی تک در و دیوار سے ٹکرا رہی ہے۔ اُس وقت متحدہ طور پر یہ آواز بلند کیجا رہی تھی کہ وہ تحریک خالصتہً اسلام کا تقاضا ہے اور اس کا مطالبہ (قیامِ نظام مصطفیٰؐ) دین کا مطالبہ جس میں کسی اور جذبہ کا شائبہ تک نہیں۔ اب ترجمان القرآن یہ کہہ رہا ہے کہ:

آہستہ آہستہ لوگوں میں یہ احساس پروان چڑھتا گیا کہ یہ سارا تماشا حصولِ اقتدار کا ہے۔ دین اصلاً مقصود نہیں۔

ترجمان القرآن یہ تاثر دے رہا ہے کہ لوگ ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ وہ تحریک حصولِ اقتدار کے لئے تھی۔ دین مقصود نہیں تھا۔ لیکن دیکھئے کہ خود اسی جماعت کے امیر، میاں طفیل محمد صاحب اس باب میں کیا ارشاد فرما رہے ہیں:۔

انہوں نے پچھلے دنوں، نواب شاہ میں شہریوں کی ایک عید ملن پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

موجودہ صورت حال سے نکلنے کے لئے تمام دینی جماعتیں اورافراد ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوجائیں۔اس سے قبل والا اتحاد صرف ایک شخص کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے تھا۔جس کے بعد یہ اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔

(روزنامہ جنگ۔لاہور۔مورخہ ۲۴۔جولائی ۱۹۸۳ء)

میاں صاحب کے اس اعتراف، یا انکشاف نے (نام نہاد) تحریک نظام مصطفیٰ کا بھانڈا پھوڑ کر رکھدیا۔وہ تحریک درحقیقت ایک شخص (یعنی بھٹو مرحوم) کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے تھی اور "نظام مصطفیٰ" کو ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا کیونکہ یہ، عوام کے نازک اور مقدس جذبات کو اپیل کرتا تھا۔(سابقہ) متحدہ محاذ میں شامل جماعتوں میں سے کسی نے میاں صاحب کے اس بیان کی تردید نہیں کی (کم از کم ہماری نظروں سے ایسی تردید نہیں گزری حالانکہ اسے شائع ہوئے قریب دوماہ ہوچلے ہیں)۔اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بھی اس سے متفق ہیں۔علاوہ ازیں، اس کے صحیح ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ (بقول میاں صاحب) جب وہ مقصد حاصل ہوگیا تو وہ اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔آپ غور فرمایئے کہ یہاں، مذہب کے نام پر قوم کو کس کس قسم کے فریب دیئے جاتے ہیں! آنے والا مؤرخ جب تحقیق کرے گا تو اقامت دین اور احیائے اسلام جیسی تحریکوں کے سلسلہ میں جو کچھ درون خانہ ہوتا ہے، نمعلوم ان کے متعلق کس کس قسم کے راز افشا ہونگے حالِ گزشتہ محترم رفیق احمد صاحب باجوہ نے اس سے ذراسا پردہ سرکایا تھا لیکن معلوم نہیں کن مصالح نے ان کا ہاتھ روک لیا اور وہ اس کے بعد پھر پیچھے ہٹ گئے۔باجوہ صاحب، قومی متحدہ محاذ کے سیکرٹری جنرل تھے،وہ تحریک کے دوران اس سے الگ ہوگئے تھے، یا الگ ہونے پر مجبور کرائے گئے تھے۔اس کے متعلق روزنامہ جنگ، لاہور، کے میگزین ایڈیشن کی (۱۹، لغایت ۲۵ مارچ ۱۹۸۲ء کی میگزین) اشاعت میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا۔اس میں انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔

تفصیل اگر آپ ضرور چاہتے ہیں تو یہ ہے کہ ۷ مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات سے چند روز پیشتر یہ خبریں مجھ تک پہنچیں یا ہوسکتا ہے کہ عمداً پہنچائی گئیں تاکہ میں بددل ہوکر علیحدہ ہوجاؤں یا غصے میں آکر عوام کو سب کچھ بتادوں جو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی طرح بھی مفید نہ تھا۔بہرحال اطلاعات یہ تھیں کہ پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کی اکثریت نے سربراہ حکومت سے سودے بازی کر لی ہے۔حکومت ان سربراہوں کے انتخابات میں کامیابی کے راستے میں حائل نہ ہوگی۔انہیں اپنے اپنے حلقوں سے کامیاب ہونے دیا جائے گا۔ اس کے صلے میں قومی اتحاد کے رہنما قومی جذبات کو حکومت کے خلاف بڑھنے نہیں دیں گے بلکہ ان جذبات کو ٹھنڈا کرکے تحریک کو ختم کردیں گے۔حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی جائے گی۔میں نے ان باتوں پر کوئی یقین نہیں کیا بلکہ انہیں مخالف کیمپ کا پروپیگنڈہ سمجھ کر غلط جانا۔لیکن جب ۷ مارچ کے قومی اسمبلی کے انتخابی نتائج سامنے آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا، اور میں سوچنے لگا کہ ان سب رہنماؤں کا کامیاب ہوجانا اور ان کے دیگر ساتھیوں کا دھاندلی کی وجہ سے ناکام ہوجانا خالی از علت نہیں ہے۔وہ دھاندلی جو اتحاد کے دیگر امیدواروں کے سلسلے میں روا رکھی گئی، اس سے اتحاد کے یہ رہنما کیسے محفوظ رہے حالانکہ یہ اس حکومت کے صفِ اول کے دشمن تھے۔ان کے حلقہ ہائے انتخابات میں تو بے مثال قسم کی دھاندلی ہونی چاہئے تھی

کیونکہ سربراہِ حکومت کو قدرتی طور پر ان رہنماؤں کا قومی اسمبلی میں موجود ہونا ناپسند تھا۔

مجھے ان اطلاعات پر یقین آنے لگا جو اس سے پہلے ہی مجھے مل چکی تھیں۔ اس روز یہ تمام رہنما اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخابات میں موجود تھے۔ لاہور میں میرے اور میاں طفیل محمد کے سوا کوئی رہنما موجود نہیں تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا کہ قومی اتحاد 25 مارچ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کرتا ہے اور قومی اسمبلی کی حاصل کردہ نشستیں ..... بھی واپس کرتا ہے۔ یہ اعلان اور فیصلہ میرا اور میاں طفیل محمد کا تھا۔[1] بنیادی طور پر میری اور میاں صاحب کی نیت ایک تھی۔ لیکن میرے دل میں جذبۂ انتقام بھی موجود تھا۔ میں اس طرح رہنماؤں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ قوم آمریت کے خلاف قومی تحریک کو کسی سودے بازی کے ذریعے نہیں روک سکتے اور اگر تم سودے بازی کرنا جانتے ہو تو ہم تمہارے سودے بازی کے منصوبے کو ناکام بنانے کی اہلیت بھی رکھتے ..... ہیں۔ آپ میرے ساتھ اتفاق کریں کہ اس سے بڑا سیاسی فیصلہ اور صحیح سیاسی عمل پاکستان کی سیاسی تاریخ میں نہ ہوا نہ اس وقت تک ہوا تھا اور نہ شاید آئندہ ہو سکے گا۔ یہی وہ بروقت فیصلہ تھا جس نے اس سودے بازی کو ناکام بنایا اور سودے اور سودے بازی کرنے والے، عوامی جذبات کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک دوسرے کے مدِمقابل آ گئے۔ قوم کی خواہشات کے خلاف ان کا کوئی خفیہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

اگر یہ ساز باز کامیاب ہو جاتی تو یہ حضرات بھٹو (مرحوم) کے رفیقِ کار ہوتے اور "نظامِ مصطفیٰ" نہایت آب و تاب کے ساتھ قائم ہو جاتا! وہ ناکام رہ گئی تو پھر بھٹو کو اقتدار سے الگ کرنے کا "جہادِ عظیم" شروع کر دیا گیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ان تصادمات میں مرنے والوں کو (جو بہرحال عوام ہی تھے۔ لیڈران میں کوئی نہیں تھا) "شہید" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

میاں طفیل محمد صاحب نے کہا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ کی تحریک دراصل انتقالِ اقتدار کی تحریک تھی۔ قومی متحدہ محاذ میں شامل دیگر پارٹیوں کے سلسلہ میں تو اس ضمن میں شاید کچھ تحقیق کرنا پڑے لیکن جماعت اسلامی نے اسے کبھی راز میں نہیں رکھا۔ طلوعِ اسلام کے زیرِ نظر شمارہ میں (چند صفحات آگے) "قرارداد مقاصد" کے عنوان سے جو مقالہ آپ کے سامنے آئے گا اس میں آپ دیکھیں گے کہ (نام نہاد) اقامتِ دین کی تحریک کی خشتِ اول ہی انتقالِ اقتدار کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد ان کے ہر اقدام کا رخ اسی سمت کو تھا۔[2] (مولانا) مودودی (مرحوم) نے قانون سازی کے سلسلہ میں جو الجھاؤ پیدا کئے ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جب وہ الجھاؤ لاینحل ہو گئے تو انہوں نے اس کا حل کیا بتایا، اسے غور سے سنئے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ

---

[1] ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں (کالعدم) جماعت اسلامی نے کس قدر دھاندلیاں کی تھیں، اس کے متعلق اس جماعت کے ایک سابقہ ممتاز رکن سید وصی مظہر ندوی کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۸۳ء (صفحہ ۵۹) میں چھپا تھا۔ اس کے باوجود انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ [2] یہ موضوع بڑے تفصیلی مقالہ کا متقاضی ہے۔

میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں۔ دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود بھی ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔ (ایشیا۔ ۹ رمئی ۱۹۷۶ء)۔

بھٹو (مرحوم) نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو قائداعظمؒ کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلہ میں منعقدہ وفاقی پارلیمان اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس میں، قائداعظمؒ کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی پرجوش تقریر کی جس میں بتایا کہ تحریک پاکستان کے دوران، کس کس نے، کس کس انداز سے قائداعظمؒ کی مخالفت کی، اس میں مرحوم نے مودودی (مرحوم) کی کتاب «مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ سوم)» کے اقتباس پر اقتباس پڑھ کر یہ بتایا کہ اس ضمن میں سب سے زیادہ شدید مخالفت مودودی (مرحوم) نے کی تھی۔

یہ دسمبر ۱۹۷۶ء کی بات ہے، اور شروع ۱۹۷۷ء میں "نظام مصطفیٰ" کے نام سے وہ تحریک شروع کی گئی جسے، میاں طفیل محمد صاحب نے انتقال اقتدار کی تحریک کہہ کر پکارا ہے۔ اس تحریک میں مودودی (مرحوم) اپنی کامیابی کے متعلق اس قدر متیقن تھے کہ انہوں نے، اسلامی جمعیۃ طلبہ کے سالانہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

اب حالات اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ آج نہیں تو چند روز بعد اس کام کو فروغ حاصل ہو گا اور ملک کا کام چلانے کا کام بھی آپ کے ذمے لگنے والا ہے۔

(ایشیا۔ ۵ نومبر ۱۹۷۸ء ص۵)

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہاں اسلام کے نام پر کس کس قسم کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ان سے کچھ کہئے تو یہ دھڑلے سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام میں سیاست، دین سے الگ نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے۔ لیکن اسلام میں سیاست، دین کے تابع رہتی ہے۔ اس میں دین کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے بطور حربہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ مقصد انتقال اقتدار ہو اور نام "نظام مصطفیٰ" (پناہ بخدا) طلوع اسلام نے نہ کبھی اقتدار کا تصور تک ہی کیا ہے۔ نہ ہی اس کا کسی شخصیت سے واسطہ ہے۔ یہ ملک کی عملی سیاست میں حصہ ہی نہیں لیتا۔ لیکن جب کوئی شخص یا جماعت دین کو اپنے مقاصد کے لئے سپر بناتی ہے تو یہ اپنا قرآنی فریضہ سمجھتا ہے کہ اس کے رخ سے نقاب الٹ کر حقیقت قوم کے سامنے لے آئے۔ اس کا یہی مسلک شروع سے چلا آرہا ہے اور ان سطور کا جذبہ محرکہ بھی یہی ہے۔

اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اگر کبھی (خدا نکردہ) اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ آگیا تو وہ مذہب کے نام پر کیا کچھ نہ کریں گے؟ آپ غور فرمائیے کہ سیکولر مسلک کے حامی حصول اقتدار کی بات کریں تو یہ حضرات انہیں ملحد اور بے دین قرار دیدیتے ہیں۔ لیکن خود حصول اقتدار کے لئے سازشیں کریں تو وہ عین مطابق اسلام قرار پا جاتا ہے۔ حالانکہ غور کیجئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیکولر لوگ ان سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ وہ اقتدار چاہتے ہیں تو اس کا برملا اعلان کرتے ہیں۔ یہ حضرات چاہتے اقتدار ہیں اور اسے نقاب "نظام مصطفیٰ" کا اوڑھاتے ہیں۔ ٹھیک کہا تھا کہنے والے نے کہ ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے!

Genesis and Ideology of Pakistan

G.A. PARWEZ

(ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟)

آجکل پھر اس قسم کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے اور اسلام سے اس کو کچھ واسطہ نہیں تھا۔ یہ شکوک و شبہات بالعموم تعلیم یافتہ دانشوروں کے حلقوں میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ ان کے ازالہ کے لئے پرویز صاحب نے پچھلے دنوں، عنوانِ بالا پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جو روزنامہ پاکستان ٹائمز (لاہور) کی ۱۲ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر تقاضے موصول ہوئے کہ اس کی عام اشاعت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اب اسے خوبصورت پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت اس کی ۲ روپے ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ اسے اپنے حلقہ اثر میں دُور دُور تک پھیلائیں۔ اس میں اقبالؒ اور قائداعظمؒ اپنے منہ سے بول رہے ہیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام لاہور

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۶۰ روپے
مکمل سیٹ جلد -/۱۸۰ روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۵۰ روپے
مکمل سیٹ -/۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوع اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب
کے
درسِ قرآن
بذریعہ
VCR
کے

کوائفِ اوقات و مقام
متعلقہ
بزم ہائے
طلوعِ اسلام

کراچی (پاکستان)

ہر جمعہ ½ 9 بجے صبح
دارالزہرہ بالائی منزل
بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲
سرمد روڈ (کراچی صدر)

گجرات (پاکستان)

ہر جمعہ بعد نماز جمعہ
رہائش گاہ: ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب
جناح کالونی
(گجرات)

اوسلو (ناروے)

ہر سنیچر
شام ۶ بجے بمقام
MR MANZOOR AHMAD
DOVRE GATE-7/OSLO-1

برمنگھم (انگلینڈ)

ہر ماہ کا پہلا اتوار
۲ بجے دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD
38.3BH (BIRMINGHAM)

دفتر ادارہ طلوعِ اسلام کے اوقاتِ کار

سنیچر تا جمعرات: ——— صبح دس بجے تا چھ بجے شام

بروز جمعہ: ——— صبح آٹھ بجے تا گیارہ بجے

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جیسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے:۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف ؛ نوٹ: پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کرلئے جاتے ہیں۔
لاہور	ہر جمعہ ۸½ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	76, PARK ROAD, ILFORD, TELEPHONE NO 553-1896
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFT WOOD AVE: #311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT:) M 3N-2P3, TEL: (416) 661-2827
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر (بالمقابل (VIA MAIN GATE PESHAWAR STADIUM) شیریں محل B.3 یونیورسٹی ٹاؤن، باڑہ روڈ فون: (۴۲۴۵۹)
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اتمان خیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی-۱۴۴ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان ۸۳۔ نظامی منزل
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳½ بجے شام	بمقام۔ حیات سرجری کلینک، پی/۲۳ پیپلز کالونی نمبر ۱، فون: (۴۲۲۸۵)
ہنگو	ہر جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ۔ فون: (۶۷)
چچکسی تحصیل کبیروالا (ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام: مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون: (۳۱۰۷۱)
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ عیسیٰ پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر۔ تورغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب۔ گل روڈ (رسول لائنز)
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ اور ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲۰/۱-بی۔ بھمبر روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲- ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب۔ واقع: L-K-234 کہیال (ایبٹ آباد) غلام مصطفےٰ اعوان صاحب واقع K-356 - گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)

شاہد عادل

(کالعدم) جماعت اسلامی اور علماء

(یہ جائزہ ۱۹۶۹ء میں لیا گیا تھا اور اس مضمون کی دوسری قسط ہے جو ستمبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس میں بھی جماعت اسلامی کے ساتھ (کالعدم) اور مودودی صاحب کے نام کے ساتھ (مرحوم) کا اضافہ کر لیجئے)۔

ڈاڑھی عادت تھی اور سنّت اور عادت میں فرق

ترجمان القرآن کے اسی شمارہ میں ایک اور عالم دین کو عادت اور سنت کا فرق یوں سمجھاتے ہیں۔

"میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے اس کی بنا پر میرا یہ فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے بلکہ اپنے عمل سے ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے، اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انہوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے۔ میں اُسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنتِ رسول یا اُسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سنت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔" (ایضاً۔ صفحہ $\frac{۲۷۴}{۱۷۸}$)

جماعتِ اسلامی کی دعوت سے لاپرواہی

ظاہر ہے کہ جن علماء کی اس قدر مخالفت کی جائے اور ان کی تنقیص و تنکیر میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی جائے، وہ جماعتِ اسلامی کی تائید

کسطرح کر سکتے تھے۔ جماعت اسلامی سے متعلقین کو علماء کیطرف سے جماعت کی مخالفت کا احساس پریشان کر رہا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے مودودی صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ ہماری دعوت "خالص اسلامی" ہونے کے باوجود اسلام پسند حلقوں میں کیوں مقبول نہیں ہو رہی۔ مودودی صاحب نے اس کا ذمہ دار علماء کو قرار دیا۔ فرماتے ہیں :۔

"رہے علماء، تو ان کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ یہی حضرات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو ان کی موجودہ حالت تک رہنمائی کی ہے۔ یہ بہار انہی کی لائی ہوئی ہے۔ دینداری اور تقویٰ، اسلام اور ایمان، توحید اور رسالت کا موجودہ مفہوم جو عوام کے ذہنوں میں راسخ ہے، انہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انہی کا کام تھا کہ تمام آفات و مصائب کے اندر سے وہ اسلام کو بچا لائے اور آج بھی اس کو بچائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے جو اتنی پیچ در پیچ خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں، آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ آج وہ کھلے دل سے اس بات کا اقرار کرینگے کہ آج تک انہوں نے جو رہنمائی کی ہے وہ غلط ہے اور صحیح راہ وہ ہے جس کی دعوت فلاں جماعت دے رہی ہے۔ بلاشبہ حق پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ اس صاف حقیقت کے اقرار سے ان کو شرم نہ آئے.... لیکن جو حضرات اپنی غلطیوں کو دین و تقویٰ بنا کر ان کی پرستش کرتے اور کراتے رہتے ہیں، ان کے لئے اپنے محبوب بتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا دین اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی تو وہ جہاد اکبر ہے جس کے اہل بہت کم نکلتے ہیں۔ اور اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کمزوری میں ہمارے علماء بھی مبتلا ہیں۔" (ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء۔ صفحہ ۱۸۵/۸۹)

علماء دعوت دین سمجھنے سے قاصر ہیں

پھر اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دیتے ہیں کہ علماء بیچارے تو ہماری دعوت اسلامی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سنیئے :۔

"جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے سنجیدہ اور سلیم الطبع لوگ بہت تیزی سے ہماری دعوت اور جماعت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور ان میں سے جتنے لوگ بھی اب تک نکلے ہیں وہ بہت پختہ اور کار آمد ثابت ہوئے ہیں۔ عربی درسگاہوں کے لوگ بھی اگرچہ اب ہماری طرف توجہ کرنے لگے ہیں لیکن ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی عقیدت میں پھنسی ہوئی ہے اور ہر بات کو برحق تسلیم کر لینے کے باوجود کسی حضرت صاحب میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ یہ چیز بھی میں نے اس ایک سال کے تنظیمی کام میں محسوس کی ہے کہ جس قدر جلدی اور آسانی سے یہ دعوت ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی کو جو طاغوتی نظام کے چکر میں پھنس کر بالکل جکڑا نہ گیا ہو، اپیل کرتی ہے اور اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، اس سے کئی گنا زیادہ دشواری عربی خوان حضرات کو اسے سمجھانے میں پیش آتی ہے۔ بلکہ ہمارے بعض دوستوں کو تو یہاں تک تجربہ ہوا ہے کہ دیہاتی کسانوں کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا گیا اور وہ فوراً ہی اس کے انتہائی مقتضیات اور مطالبات پا گئے، لیکن اچھے اچھے ذی علم اصحاب قال اقول کے چکر ہی میں پڑے رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بجائے عربی خوان بھائی ایک تو براہ راست قرآن و حدیث سے دین اخذ کرنے کے بجائے بعض مخصوص رجال سے اپنا دین لینے کے خوگر بنا دیئے گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساری کی ساری گروہی عصبیتوں اور مختلف عقیدتوں کو عین تقاضائے دینداری بنا کر اس طرح ان کے ذہن نشین کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ اپنے حلقے سے باہر کسی دینداری کے قائل ہی نہیں رہتے۔" (ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۱۵/۱۹ - ۱۱۶/۲۰)

سجادہ نشین اور بھڑوں کے چھتے

جماعت اسلامی سے بعض متعلقین نے یہ سوچا کہ عوام کو جماعت کے قریب لانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سجادہ نشینوں اور پیروں کو اپنی تحریک کا ہمنوا بنایا جائے

چنانچہ جماعت کے ایک اجتماع میں یہ تحریک پیش کی گئی کہ

تجویز نمبر ۱۵: "سجادہ نشینوں اور پیروں کو اس تحریک کی طرف دعوت دینے کے لئے کوئی خاص قدم اٹھایا جائے کیونکہ ان میں سے کسی ایک شخص کی شرکت کئی ہزار آدمی کی شرکت کے ہم معنی ہے؟

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

امیر جماعت اسلامی کا فیصلہ

"اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں یہ طبقہ بہت زیادہ با اثر ہے اور لاکھوں کروڑوں آدمی اس سے وابستہ ہیں لیکن ان میں بہت کم آدمی ایسے ہیں جو واقعی صاحب خیر، خدا ترس اور حق پسند ہیں۔ اکثریت اس طبقے میں ایسے لوگوں کی ہے جن سے زیادہ خدا سے پھرے ہوئے لوگ غالباً دنیا میں نہیں ملینگے انہوں نے حق کے لئے صرف اپنے ہی کان نہیں بند کر رکھے ہیں بلکہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کے کانوں اور دلوں پر مہریں لگا رکھی ہیں۔ انہیں دعوت دینے کا فائدہ یہ تو نہ ہو گا کہ وہ حق کی آواز پر لبیک کہیں گے اور ہم خدائی کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائینگے البتہ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہو گا کہ ہم بھڑوں کے چھتے میں خود ہی پتھر پھینک پھینک کر ان کو کاٹنے پر اکسائیں گے۔

(ترجمان القرآن۔ مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۷۲-۱۷۳)

عید میلاد اور دوسرے مذہبی جلسے

یہ واضح رہے کہ پیر پرستی بیشتر بریلوی حضرات کا مسلک ہے۔ علاوہ بریں یہ حضرات عید میلاد، محفلِ قرأت، اور دوسرے اسی قسم کے مذہبی جلسوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ جماعت کے ایک صاحب نے مودودی صاحبؒ سے ایسے جلسوں میں شرکت کی بابت دریافت کیا تو آپ نے یہ جواب دیا۔

"میرے نزدیک میلاد یا سیرت کے یہ جلسے جو ربیع الاول کے موسم میں ہوتے ہیں مسلمانوں کے ان تفریحی مشاغل میں شامل ہو گئے ہیں جن سے مقصود بجز اپنے نفس کو یہ فریب دینے کے اور کچھ نہیں ہے کہ خدا کا اور رسول کا جو حق ہے وہ اسے بس اس طرح ادا کیے دے رہے ہیں اور ایسی ہی ذہنیت ان کے دوسرے مذہبی جلسوں کی بھی ہو کر رہ گئی ہے اس لئے میں اس قسم کے جلسوں میں شرکت کو نہ صرف یہ کہ غیر مفید سمجھتا ہوں بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہم مسلمانوں کی اس روحانی بیماری کو قوت پہنچانے کے مجرم نہ ہو جائیں" (ترجمان القرآن۔ جنوری، فروری ۱۹۴۵ء صفحہ ۹۱)

مجالس قرأت اور سرکس کے کھلاڑی

مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) مکہ شریف میں ایک مجلس قرأت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"تلاوت کرنیوالے صاحب تلاوت نہیں کر رہے بلکہ کرتب اور فن دکھا رہے ہیں ایک ایک آیت کو پانچ پانچ چھ چھ طریقوں سے پڑھنا فن دانی کے اظہار کے لئے مناسب ہو تو ہو لیکن تذکیر و ہدایت کے لئے جو کتاب اتاری گئی تھی سکے سامنے ہمارے قراء کا یہ سرکس کے کھلاڑیوں کا سا برتاؤ حد درجہ افسوسناک ہے۔ راقم کو اس منظر سے سخت اذیت پہنچی"

(دیارِ عرب میں چند ماہ۔ صفحہ ۴۴۲)

مسلمانوں کی دینی بیماریوں کا علاج

علماء کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمان جن دینی بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں اور جن کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں، مودودی صاحبؒ کے نزدیک

ان کا ایک بڑا علاج "تقلید" کا ختم کرنا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے ان کا مندرجہ ذیل فیصلہ ملاحظہ فرمایئے:۔

تقلید گناہ سے شدید تر ہے

"میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر ہے۔" (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۴۴)

ان کے اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ تھا کہ ہمارے علماء جو حنفی ائمہ کی تقلید میں حنفی فقہ کی معتبر کتابوں مثلاً ہدایہ اور عالمگیری

حنفی فقہ کی کتابیں

وغیرہ کے حوالے دیتے تھے وہ سب مولانا مودودی کی نظر میں دفتر بے معنی ہو جائیں۔ چنانچہ ان کتابوں کے بارے میں بھی یہ تصریح انہوں نے خود ہی فرما دی۔

"میں اس بات کا بھی سخت مخالف ہوں کہ علماء کرام وقت کے رجحانات سے منہ موڑ کر بیٹھ جائیں۔ اور اس امر کو بھول جائیں کہ وہ ہدایہ اور بدائع کے زمانہ تصنیف میں نہیں بلکہ نت نئی سائنٹیفک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دور میں رہتے ہیں۔ اس دور میں روز روز نئے مسائل کا پیدا ہونا لابد ہے اور ان مسائل کو ہدایہ اور بدائع کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں جس کا خطرہ نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں کیا ہے۔ رہنمائی کے لئے علماء اسلام میں وسعت نظر اور روح اجتہاد کی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر عالمگیری اور تاتارخانی کو لاکر سدِّ راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانے کا مسلمان قرآن و حدیث کو پیچھے چھوڑ کر مدھر منہ اٹھے گا چل نکلے گا جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے۔" (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

اسی سلسلہ میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

ہدایہ اور عالمگیری قیامت کے دن پناہ نہیں دیں گے

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئینگے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا۔ تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔" (حقوق الزوجین۔ طبع ششم صفحہ ۹۸)

علماء کے خلاف نفرت و حقارت فطری حد کے اندر رہے

علماء کے خلاف اتنی سخت مہم چلائی جائے تو اس کا نتیجہ لازمی ہے کہ عامۃ الناس اور خاص کر جماعت اسلامی سے متعلق حضرات کے دلوں میں طبقہ علماء کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا۔ تاہم جماعت اسلامی کے بعض حضرات نے محسوس کیا کہ جماعت کے لوگوں میں علماء کے خلاف جو نفرت و حقارت پیدا ہو گئی ہے وہ جماعت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اور اسکے سدباب کے لئے انہوں نے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی سے گزارش کیا۔ یہ گزارش اور امیر جماعت اسلامی کا جواب ہم ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" سے نقل کرتے ہیں۔

سوال: میں نے اجتماع کے موقعہ پر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقاء میں علمائے اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کے

جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ کہیں تعصب اور تحزب میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسے کہ پہلے بھی متعدد تحریکیں صحیح خطوط پر چل کر آخر کار فرقہ بندی پر جا ختم ہوئیں۔ اس فتنہ کا بروقت سدِباب ہونا چاہیئے۔ علماء اپنے رویہ میں ایک حد تک معذور ہیں کیونکہ انہوں نے ایک خاص ماحول میں دماغی تربیت پائی ہے اور خاص طرزِ فکر سے وہ مسائل کو سوچنے کے عادی ہیں۔ ہمیں ان کی اس معذوری کا لحاظ رکھنا چاہیئے"۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:۔

مولانا مودودی صاحب کا جواب

علماء کے متعلق جس رویّہ کی شکایت آپ نے کی ہے وہ یقیناً ایک حد تک پایا جاتا ہے اور میں خود بھی اس کو محسوس کرتا ہوں۔ لیکن ابھی تک میرے نزدیک وہ فطری حد کے اندر ہے۔ جب دین کے لئے کوئی کام کیا جائے اور وہ بالکل صحیح دینی طرز پر بھی ہو، اعتقادی و عملی حیثیت سے کوئی قباحت بھی اس میں نہ بتائی جاسکے اور کسی لوث یا غرضِ دنیوی کی نشاندہی بھی اس میں نہ کی گئی ہو اور پھر بھی علماء کی طرف سے کا صرف یہی نہیں کہ ساتھ نہ دیا جائے بلکہ مخالف کا رویہ اختیار کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پر لوگوں کے رنجیدہ نہ ہونے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے اور لوگ جب رنجیدہ ہوں تو اس کے رنج کا اظہار آخر کس شکل میں ہو..... آپ خود چونکہ علماء کے اس گروہ سے وابستگی رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ عقیدت مندی کی لگاوٹ بھی ابھی تک لگی ہوئی ہے۔ اس لئے ان حضرات کی غلط روش پر جن لوگوں کو رنج ہے انکے رنج پر تو آپ کو شکایت ہے لیکن خود اس غلط روش پر آپ ان حضرات کو ایک حد تک معذور پاتے ہیں کاش

علماء غلط کار ہیں

زمانہ کے سینہ میں بھی آپ کا سا دل ہوتا کہ وہ بھی اس قسم کی معذوریوں کا لحاظ کر کے کسی کے ساتھ رحم کرنے پر تیار ہو جاتا۔ لیکن آپ یقین رکھیئے کہ آپ کے دل میں غلط کاروں کے لئے خواہ کتنے ہی نرم گوشے ہوں، زمانہ ایسے نرم گوشے اپنے سینے میں نہیں رکھتا"۔　　(ترجمان القرآن، مارچ تا جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۲۶۸/۱۶۷)

اس نفرت اور حقارت کے خلاف علماء کا ردِّ عمل

جماعت کی طرف سے علماء کے متعلق جو اس قدر نفرت اور حقارت پیدا کی گئی اور اس کا تدارک کرنے کی بجائے الٹا امیرِ جماعت نے اسے شہ دی تو اس کا ردِّ عمل ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے علماءِ دین اور مفتیانِ شرعِ متین سے خود مودودی صاحب کے مسلک کے متعلق فتاویٰ طلب کئے۔ اس بارے میں مفتی کفایت اللہ سے جو فتویٰ حاصل کیا گیا وہ فتویٰ اور مولانا مودودی صاحب کی طرف سے اس کا جو الزامی جواب دیا گیا تھا، قارئین کے پیشِ خدمت ہے:۔

سوال: یہاں سے فتویٰ دریافت کرنے کے لئے مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم دہلی کے پاس روانہ کیا گیا تھا کہ مولانا، مولوی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اتباع جائز ہے یا ناجائز۔ جواب وہاں سے یہ آیا کہ مولانا مولوی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کسی بھی امام کے قائل نہیں ہیں۔ آزاد خیال آدمی ہیں۔ اس لئے ان کا اتباع شرعاً ناجائز ہے۔ اس لئے آپ سے استدعا ہے کہ آپ اپنے خیال کا اظہار فرمائیں۔

مولانا مودودی صاحب کا الزامی جواب

"میں حیران ہوں کہ جن لوگوں نے مولانا کفایت اللہ صاحب سے یہ سوال کیا تھا انہوں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ بھی مولانا کفایت اللہ

صاحب تیس سال سے گاندھی اور نہرو کا اتباع کر رہے ہیں اور آج بھی انہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے، کہ مسلمانوں کو کانگریس کے حق میں ووٹ دینا چاہیئے، کیا کانگریس کسی امام کی قائل ہے؟ بلکہ کیا کانگریس خدا اور رسول کو بھی مانتی ہے؟ پھر جو عالمِ دین کانگریس کے معاملہ میں تو اماموں کے ماننے یا نہ ماننے کا لحاظ نہ کرے مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اسے امام یاد آنے لگیں، کیا وہ اس قابل بھی ہے کہ اس کے فتویٰ کا لحاظ کیا جائے؟" (ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۹/۱۱۹)

مفتی کفایت اللہ کے فتویٰ کیخلاف پیش بندی

مفتی کفایت اللہ کا فتویٰ شائع ہونے کے بعد علماء میں اس کا خوب خوب تذکرہ ہونے لگا، اس لئے اس بات کا امکان تھا کہ شاید جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اس سے متاثر نہ ہو جائیں، انہی دنوں جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کا اجتماع بھی ہو رہا تھا جس میں شاید مفتی صاحب کے فتویٰ کے اثرات کی پیش بندی کے طور پر جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ سے یہ فیصلہ کرا لیا گیا ہو۔

"خالص شرعی امور میں جن کا تعلق اجتہاد یا تعبیرِ نصوص سے ہو مجلسِ شوریٰ بالعموم امیر کی رائے قبول کریگی"۔
(ترجمان القرآن - جون - جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۹۴/۱۹۴)

علماء کے فتاویٰ کی بھرمار

ایک دفعہ اگر علماء کے کسی طبقہ سے فتویٰ کی ابتداء ہو جائے تو پھر اس سیلاب کو روکنا ممکن نہیں ہوتا، چنانچہ علماء کے ہر طبقہ کی جانب سے جماعتِ اسلامی کے خلاف فتاویٰ شائع ہونے شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام فتاویٰ کا نقل کرنا ہمارے لئے مشکل ہے ویسے بھی یہ کوئی خوشگوار چیز نہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب نے ان تمام فتاویٰ کا جو مشترکہ جواب دیا اس کا پیش کر دینا ہی کافی ہوگا۔

علمائے دیوبند، سہارنپور، دہلی اور تھانہ بھون کے فتاویٰ

"میں نے ان سب فتووں کو بغور پڑھ لیا ہے، یہ کسی جواب کے لائق نہیں ہیں صرف اس لائق ہیں کہ انہیں اٹھا کر رکھ لیا جائے اور اس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ فتووں میں مجھے اپنی کسی غلطی کا نشان مل جائے جو واقعی میں نے کی ہو اور ان حضرات نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دی ہو، ایسی کوئی چیز ملتی تو میں یقیناً اس کا جواب دینے کی بجائے مان لیتا اور اپنی اصلاح کر لیتا۔۔۔۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم ان غلط بیانیوں اور تحریفات کا پردہ کیوں نہیں چاک کر دیتے جو دعوت الی الخیر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ اگر کوئی ایک فتویٰ یا ایک اشتہار ہوتا تو شاید میں بادلِ نخواستہ اس کی غلطیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کر گزرتا۔

شیطان کی فصل

اگرچہ ایسی چیزوں کی طرف توجہ کرنا میرے لئے سخت کراہت کا موجب ہے لیکن یہاں تو پاکستان سے ہندوستان تک ہر طرف فتووں، پمفلٹوں، اشتہاروں اور مضامین کی ایک فصل اگ رہی ہے جس میں کیمونسٹ، سوشلسٹ، فرنگیت زدہ ملحد، قادیانی، منکرینِ حدیث، اہل حدیث، بریلوی اور دیوبندی، سب ہی اپنے اپنے سٹگوفے چھوڑ رہے ہیں اور آئے دن نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اس فصل کو آخر کون کاٹ سکتا ہے اور کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔ مجھے اگر دنیا میں اور کوئی کام نہ کرنا ہو تو میں اسے کاٹنے پر اپنی

عمر کھپائیں اور جماعتِ اسلامی اگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دستبردار ہو جائے تو اس پر اپنی محنت ضائع کرے۔ ہمارے مخالفین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس۔۔۔"

علماء اور جھاڑ جھنکار

حماقت میں مبتلا ہوں اور جھاڑ جھنکار سے الجھ جائیں تاکہ فساق و فجار کی قیادت کو اپنا کام کرنے کے لئے صاف راستہ مل جائے۔ لیکن ہم نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شیطان کی نسل ہے جو ہی اسے کاٹے گا، خود نہ کاٹے گا تو سنت اللہ یہی ہے کہ بالآخر اس کو خود ہی اسے کاٹنا پڑے گا۔"

(ترجمان القرآن، مارچ تا مئی ۱۹۵۱ء، صفحہ ۲۰/۱۴۸ ؛ ۲۱/۱۴۹)

کچھ اور فتاویٰ کا جواب

اگرچہ مولانا مودودی صاحب فرما تو یہ رہے ہیں کہ ان کے لئے ان فتاویٰ کا جواب دینا موجبِ کراہت ہے لیکن اس کے باوجود اس دوران میں جماعتِ اسلامی کا کوئی رسالہ یا اخبار اٹھا کر دیکھئے اس میں سب سے نمایاں بحث یہی ہوگی۔ خود ترجمان القرآن کے کئی پرچوں میں یہ سلسلہ جاری رہا چنانچہ ایک صاحب نے کچھ مزید فتاویٰ انہیں ارسال کئے تو انہوں نے علماء پر طنز کے یہ تیر چلائے۔

علماء اور بے دین قیادت کا گٹھ جوڑ

آپ کے عنایت نامے سے ان اسباب کا سراغ ملا جن کی وجہ سے دیوبند اور سہارنپور سے لے کر مدرسہ امینیہ تک میں یکایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی اکثریت یا تو قلتِ فہم کے باعث یا کم ہمتی کے سبب سے یا پھر اپنی نااہلی کے اندرونی احساس کی وجہ سے دین و دنیا کی تقسیم پر راضی ہو چکی ہے جس کا تخیل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا۔۔۔۔ اس تقسیم کو قبول کر لینے کے بعد یہ حضرات اپنی تمام تر قوت دو باتوں پر صرف کرتے رہے ایک اپنی محدود مذہبی ریاست کی حفاظت جس کے مسائل اور معاملات میں کسی کی مداخلت انہیں گوارا نہیں ہے۔ دوسرے کسی ایسی بے دین قیادت سے گٹھ جوڑ جو مذہب کے محدود دائرے میں ان کی اجارہ داری کی بقا کی ضمانت دے اور اس دائرے سے باہر کی دنیا پر جس فسق و فجور اور جس ضلالت کو چاہے فروغ دیتی رہے۔ اس طرح کی ضمانت اگر کسی قیادت سے انہیں مل جائے تو یہ دل کھول کر اس کا ساتھ دیتے ہیں، اور خود جان لڑا کر اسے قائم کرنے میں دریغ نہیں کرتے، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ کفر و الحاد اور فسق و ضلالت تمام سیاسی، معاشی اور تہذیبی قوتوں پر قابض ہو کر پورے دین کی جڑیں ہلا دے۔"

(ترجمان القرآن، مارچ، مئی سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۴/۱۵۲ ، ۲۵/۱۵۳)

مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے فتویٰ کا جواب

ترجمان القرآن کی اس سے اگلی اشاعت میں مودودی صاحب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے فتویٰ کا بڑا مفصل جواب دیتے ہیں جس کا پورے کا پورا نقل کرنا تو ممکن نہیں، صرف پہلا پیرا نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

سب سے نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد کے اس بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے وہ ان کی زبان ہے جسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایانِ شان سمجھتے ہوں مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ یہ زبان ان کے مرتبے سے فروتر نظر آتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ سے اختلاف ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ سخت سے سخت اختلاف ہو سکتے ہیں اور سخت سے سخت

اظہارِ رائے شریفانہ زبان میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ زبان کہ جس سے اختلاف ہوا، اس کے خلاف "ٹٹ پونجیئے" کم بخت، بدبخت اور خبیث جیسے رکیک الفاظ استعمال کئے جائیں،[1] ایک مہذب آدمی کے بھی شایانِ شان نہیں ہے کجا کہ ایک ایسا مردِ بزرگ اس کو اختیار کرے جو اس برِاعظم کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کا مسند نشین ہے اور جس کی طرف ہزار ہا آدمی تعلیم دین ہی کے لئے نہیں تزکیہ نفس کے لئے بھی رجوع کرتے ہیں۔ جب قوم کے مقتدا اور مربی و معلم اس طرح کی باتوں پر اتر آئیں تو بعید نہیں کہ ان سے اخلاق و تہذیب کا سبق لینے والے اصاغر آدمیت سے بالکل عاری ہو جائیں اور اس قوم میں نام کو بھی ایک دوسرے کی عزت کا پاس باقی نہ رہ جائے۔ ؎

اذا کان ربّ البیت بالطبل ضاربًا　　　فلا تکم الاولاد فیہ علی الرقص

(ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۶۶/۴۲، ۱۶۷/۴۳)

ترجمان القرآن میں اس شعر کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ اس کمی کو ہم پورا کئے دیتے ہیں۔

ترجمہ:۔ اگر گھر کا بزرگ طبلہ بجانے لگ جائے تو پھر اس کی اولاد کو ناچنے پر ملامت نہ کرو۔

فتوے دینے والے علماء سے خط و کتابت کا مشورہ

کسی صاحب نے امیر جماعت اسلامی کو مشورہ دیا کہ جماعت اسلامی اور علماء کے درمیان جو یہ کشمکش چل پڑی ہے اس کو ختم کرنے کے لئے "وہ فتویٰ دینے والے حضرات علی الخصوص حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا محمد طیب صاحب، حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا حافظ عبداللطیف صاحب سے خط و کتابت کر کے انہیں مشورہ دیں کہ اگر میرے متعلق یا جماعت کے متعلق کوئی استفتا آپ کے سامنے آئے تو جواب دینے سے پہلے آپ مجھ سے اصل حقیقت معلوم کر لیا کریں۔" (ترجمان القرآن بابت مارچ مئی ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۰/۱۰)

امیر جماعت اسلامی کا جواب

مودودی صاحب کی طرف سے اس تجویز کا یہ جواب دیا گیا۔

"آپ کے مخلصانہ مشوروں کا بہت شکر گزار ہوں۔ ممکن تھا کہ میں ان مشوروں پر عمل بھی کرتا۔ لیکن اتفاق کی بات کہ آپ کا عنایت نامہ ملنے کے دوسرے ہی روز ایک صاحب نے مجھے مفتی سعید احمد صاحب کا مفصل فتویٰ، جو "کشفِ حقیقت" کے نام سے چھپا ہے، بھیج دیا۔ اور اس کے ساتھ دو تین اور اشتہار بھی بھیجے جن میں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا جمیل احمد تھانوی، مولانا اعزاز علی صاحب اور مفتی مہدی حسن صاحب کے فتاویٰ درج تھے۔ ان تمام فتووں کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی۔ اب یہ حضرات اس مقام سے گزر چکے ہیں جہاں ان کو خطاب کرنا مناسب اور مفید ہو۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب پر ہے کیونکہ میں بتیس (۳۲) سال سے ان کا نیاز مند ہوں اور ہمیشہ ان کا احترام

---

[1] مودودی صاحب کے معتقدین نے اسلامؒ مولانا احمد علی مرحوم کے خلاف جو "مہذب" زبان استعمال کی تھی اس کا نمونہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ مودودی صاحب کا انداز ہی یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں خود تو مہذب بنے رہتے ہیں لیکن اپنے حاشیہ برداروں کو شتر بے مہار کر دینے کے پیچھے لگا دیتے ہیں کہ وہ انہیں جو جی میں آئے کہیں۔ (طلوع اسلام)

کرتا ساہوں۔ افسوس کہ انہوں نے جماعتی عصبیت میں آنکھیں بند کرکے یہ فتویٰ تحریر فرمایا۔ یہ بہت بُرا توشۂ آخرت

مفتی کفایت اللہ کا بُرا توشۂ آخرت

ہے جو انہوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے ساتھ لیا ہے۔ باقی رہے دوسرے حضرات، تو ان کے فتوے پڑھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ جس وقت یہ فتوے لکھے جا رہے تھے، اس وقت خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس شاید ان کے قریب بھی موجود نہ تھا خصوصاً مفتی احمد سعید صاحب کے فتووں میں تو صریح بددیانتی کی بدترین مثالیں پائی جاتی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر گھن آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان حضرات کے ساتھ بڑا

فتوے باز کافرساز مولوی

حُسنِ ظن رکھتا تھا مگر اب ان کے یہ فتوے دیکھ کر تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بریلوی طبقہ کے فتوے باز کافرساز مولویوں سے ان کا مقام کچھ بھی اونچا نہیں ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲/۱۵۹)

فتاویٰ کے ان حوالوں کے باوجود امیر جماعتِ اسلامی صاحب یہی فرماتے رہے کہ ہم ان فتاویٰ کا جواب نہیں دیں گے۔ حالانکہ جماعتِ اسلامی کے اہلِ قلم نے نظم ونثر میں ان علماء کے خلاف وہ کچھ لکھا کہ توبہ ہی بھلی ہم اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتے تھے لیکن عدمِ گنجائش اس کی مانع ہے صرف ایک مثال پیشِ خدمت ہے اور اسے بھی ہم دل پہ پتھر رکھ کر نقل کرتے ہیں۔

مولانا احمد علی صاحب (مرحوم) اور جماعتِ اسلامی

جماعتِ اسلامی کی مخالفت کرنے والوں میں سے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری (مرحوم) بھی تھے۔ دوست اور دشمن ان کے اخلاص اور تقویٰ کے معترف تھے لیکن جماعتِ اسلامی نے ان کے خلاف کیا کیا رکیک الفاظ استعمال کئے تھے اس کا نمونہ جماعتِ اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" نے اپنی ۱۸ نومبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں یوں پیش کیا تھا: (یاد رہے کہ یہ الفاظ مولانا نصراللہ خاں صاحب عزیز مدیر "ایشیا" کے رشحاتِ قلم کے رہینِ منت تھے) سنیئے:

"جاہل بہتان طراز، مفتری، اخلاقی تعلیمات سے بے بہرہ۔ تقویٰ، تقدس، للّٰہیت اور تقرب الی اللہ کا ڈھونگ رچانے والے، فریبی، جھوٹے، مذبوحی حرکتیں کرنے والے، علم واخلاق سے بے تعلق، فاسد ذہنیت کے مالک، پیشہ ور دیندار، عقل کے اندھے، غیر ذمہ دار۔ خدا اور مخلوق کی شرم سے بے بہرہ بے حیا۔ بے وقوف، گھناؤنے اور مکروہ اخلاق کے مالک، دیوبند کی چراگاہ سے نکلے ہوئے فریبی۔ دجل وکذب کے مالک، کفن چور، انبیائی شوریدہ سر وغیرہ وغیرہ۔"

دیوبند والے جواب دینے سے عاجز آگئے

چنانچہ جماعتِ اسلامی کے مختلف اخبارات ورسائل میں نظم ونثر میں جو جوابات دیئے گئے خود دیوبند والے اس کا جواب دینے سے عاجز آگئے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کا رسالہ دارالعلوم بابت جون ۱۹۵۲ء رقمطراز ہے:

"مودودی صاحب کی تحریروں اور دینیات میں ان کے خاص طرزِ فکر سے جماعتِ دیوبند کو اختلاف ہے اور اس

؎ اس احترام کی مثال پچھلے صفحات میں گذر چکی ہے جو کچھ مودودی صاحب نے زمرۂ علماء کے متعلق فرمایا تھا کیا مفتی کفایت اللہ صاحب اس کی زد سے محفوظ رہے تھے؟

اختلاف کو ہم رسالہ "دارالعلوم" کے کئی مضامین میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش بھی کر چکے ہیں ان مضامین کے بعد بھی اگر ہمارا یہ اختلاف کسی کی نظر میں تشریح و تفصیل کا محتاج ہو تو وہ دارالعلوم کے ادارہ تصنیف و تالیف کے وہ رسائل دیکھ سکتا ہے جو اس سلسلہ میں حال ہی میں تیار ہوئے ہیں۔ مودودی صاحب کے ہمنوا اخبارات اور رسائل نے ہمارے اس اصولی اور دینی اختلاف کے سلسلہ میں اخباری مضامین کی ایک زبردست مہم شروع کر رکھی ہے۔ ان حضرات کے نکتہ دعمل کی نبضیں ٹٹولنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی اچھی تحریک کی کامیابی کے لئے اس کے پس پشت کسی اچھے عقیدے، اچھے دماغ، اچھے کردار اور اچھی تاریخ کی اتنی ضرورت نہیں سمجھتے جتنی تحریر بازی، قلمکاری، انشاپردازی اور اصولی مباحث میں بھی زائد سے زائد الفاظ کے استعمال کی خیال کرتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اس فکر کے چیدہ چیدہ حضرات کے پاس بھی الفاظ اور بے معنی الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم نے پہلے دن سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ان مضامین کا ہم کوئی جواب نہیں دیں گے جو اصولی حیثیت نہیں رکھتے"

علماء اور جماعتِ اسلامی کے درمیان جو یہ ہم چل رہی تھی تو اسی دوران تبلیغی جماعت کی ایک مشہور و معروف ہستی مولانا منظور نعمانی صاحب نے انہیں "اکرام مسلم" کا خیال رکھنے کا مشورہ دیا تاکہ ان کی چپقلش کہیں زیادہ خطرناک صورت اختیار نہ کر جائے ان کے مشورہ پر تو کیا عمل کیا جاتا، الٹا انہیں اپنی تبلیغی جماعت کے لئے "بدھ مت کے بھکشو" کی پھبتی سننی پڑی۔ چنانچہ اس مشورہ کا جماعت کی طرف سے یہ جواب دیا گیا۔

تبلیغی جماعت اور بدھ مذہب کے بھکشو

"ان کا منشا یہ ہے کہ جو فساق و فجار اور علمبردارانِ بدعت و ضلالت مسلمانوں کے بھیس بدل کر کام کر رہے ہیں، اوّل تو ان سب کی تنظیم و تکریم کرو اور ان کے خلاف زبان کھولو ہی نہیں اور اگر اس پر تم صبر نہیں کر سکتے تو ان پر علی الاعلان نکیر نہ کرو، بلکہ ان کی کوٹھیوں پر حاضری دے کر عاجزی و مسکنت کے ساتھ دست بستہ کچھ خدا رسول کی باتیں عرض کر دیا کرو۔ مولانا کی اپنی جماعت کا رویہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ یہی ہے۔ اس نے نہ ہندوستان میں کبھی ان لوگوں کے خلاف آواز اٹھائی جن کی بدولت وہاں بے دینی کا طوفان اٹھ رہا ہے اور نہ اسے پاکستان میں کبھی یہ توفیق ہوئی کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر یہاں کی قیادتِ فاسقہ کے خلاف قولاً یا عملاً کچھ کرتی۔ اسی وجہ سے یہ جماعت پاکستان میں بھی حکومت اور حکام کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی ہوئی ہے حتیٰ کہ یہاں کے فرمانروا دل سے یہ چاہتے ہیں کہ "مذہب" کے لئے اگر کچھ کام کیا جائے تو اسی جماعت کے طریقہ پر کیا جائے اور اسی وجہ سے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس جماعت کی سرگرمیاں ہندوستان کی حکومت کی نگاہوں میں کبھی نہیں کھٹکیں۔ کیونکہ بدھ مذہب کے بھکشوؤں کی طرح کام کیا جائے تو اس پر چنگیز خانی سلطنت کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" (ترجمان القرآن بابت نومبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۳۹/۶۷)

اس وقت تک جماعتِ اسلامی کی سیاست زیرِ نقاب تھی۔ اب ان کی مصلحتوں کا تقاضا ہوا کہ اس نقاب کو چلمن سے بدل دیا جائے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ درحقیقت ایک سیاسی جماعت ہے جس نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے تو اس سے انہیں بڑا غصہ آجاتا ہے اور جواب میں کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ اس لئے ہم مذہبی جماعت بھی ہیں اور سیاسی بھی یہ ٹھیک ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست الگ الگ نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی سیاست ہے جو دین سے الگ نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ سیاست

محمدیہ ہے جو دین سے الگ نہیں۔ میکیاولی سیاست تو دین کی نقیض ہے اور جماعتِ اسلامی کی سیاست مذہب کے نقاب میں میکیاولی سیاست ہے، دین کی سیاست نہیں، سیاست کے اصول وحیِ خداوندی پر مبنی ہوتے ہیں جن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ماحول میں غیر متغیر رہتے ہیں۔ ان میں نہ لچک ہوتی ہے نہ مداہنت کی گنجائش۔ اس کے برعکس، میکیاولی سیاست کے اصول لچکدار ہوتے ہیں جن میں، بہ تقاضائے مصلحت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ جماعتِ اسلامی کی سیاست میں اصول لچکدار ہوتے ہیں، اس وقت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی جب مودودی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں اعلان کیا کہ،

حکمتِ عملی کی پالیسی کا اعلان

"یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے کی کن چیزوں کو راستے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصد کی اہمیت دینی چاہیئے اور اپنے اصولوں میں کن میں لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔"

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۶ء بحوالہ المنبر ۱۸۔ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ)

جماعتِ اسلامی کے ایک کثیر گروہ نے حکمتِ عملی کی اس پالیسی کو سنتِ اسلامیہ سے دھوکا تصور کیا اس لئے

مولانا امین احسن اور دوسرے اہلِ علم کی جماعت سے علیحدگی

ان کے لئے جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ ان علیحدہ ہونے والوں میں.... جماعتِ اسلامی کے مخلص السابقون الاولون کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔

اسکی ضرورت

اس نقاب برافگندگی کی ضرورت یوں لاحق ہوئی کہ اس جماعت نے ملکی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے، ان کا فیصلہ یہ تھا کہ شریعت کی رو سے، بطور امیدوار کھڑے ہونا ناجائز ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخابات جیتنے کے لئے عوام کی اکثریت کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اور ہمارے ہاں عوام بہرحال علماء کے زیرِ اثر ہیں۔ اس لئے جماعتِ اسلامی کی "شرعی مصلحت" کا تقاضا ہوا کہ علماء کے متعلق اپنی روش کو بدلا جائے۔ اس کے لئے کیا اقدامات کئے گئے، اسے غور سے سنیئے۔

حنفی فقہ کی سربلندی کی کوشش

حنفی فقہ، حنفی کتبِ فقہ اور تقلیدِ ائمہ کے متعلق ان کے جو خیالات تھے، ان کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ لیکن حکمتِ عملی کی پالیسی کے بعد مودودی صاحب نے یہ "تاثر" دینے کی کوشش شروع کر دی کہ وہ تو عملاً حنفی فقہ کو اس ملک میں نافذ کرانے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کر دی کہ پاکستان کا مکمل قانون یہاں کی اکثریت کی تعبیر کے مطابق ہوگا۔ یعنی یہاں فقہ حنفی بطور ملکی قانون نافذ کر دی جائے گی۔ یہ وہی فقہ ہے جسے مودودی صاحب "منجمد شاستر" کہہ کر پکارتے تھے اور امت کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے تھے۔

عائلی قوانین میں مسلک کی تبدیلی

ہمارے ملک میں ۱۹۶۱ء میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے وہ امیر جماعتِ اسلامی کی کتاب "حقوق الزوجین" کی سفارشات سے ملتے جلتے تھے۔ چونکہ اس میں کئی باتیں حنفی فقہ کے خلاف تھیں اس لئے اس پر اعتراضات بھی ہوئے لیکن انہوں نے اعتراض کرنے والوں

کو خوفناک شرعی دھمکی دی لیکن جب یہ قوانین حکومت کی طرف سے نافذ ہوئے تو خود جماعت اسلامی والے ان کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے کہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہیں (عائلی قوانین پر چودہ علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۸)

اتحادِ جمعیت العلماء کا قیام

اسی دوران جماعتِ اسلامی کے ایک سرگرم کارکن کی نگرانی میں، جمعیتِ اتحادِ علماء کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے اس ادارہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا کیا کوششیں ہوئیں، ان کی تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں: تاہم حال ہی میں جماعتِ اسلامی کے ایک نقیب ہفتہ وار "ایشیا" کے "اتحاد العلماء" نمبر میں جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں ان کے مطابق کوئی ۲۳۰۰ (دو ہزار تین سو) علماء حق اس تنظیم میں شامل ہوئے ہیں، جن کی فہرست اس میں شائع کی گئی ہے۔ علماء کی جو یہ کثیر جماعت ان کے زیرِ اثر آئی ہے، ان کی زیرِ نگرانی صرف مغربی پاکستان میں درسِ نظامی کے ۳۷ مدرسے چل رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ایشیا "اتحاد العلماء نمبر" صفحہ ۴۳)

درسِ نظامی کے مدارس کے بارے میں جماعتِ اسلامی کا جو نقطۂ نظر ہے وہ پچھلے صفحات میں سامنے لایا جا چکا ہے۔ لیکن حکمتِ عملی کی پالیسی کے تحت اس بارے میں جو لچک پیدا کی گئی ہے، وہ مدیر ترجمان القرآن کی زبانی سنیئے۔ وہ ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۷ کے اشارات میں لکھتے ہیں:

درسِ نظامی ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرتا ہے

"مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ درسِ نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں بہتر ہے اس نصاب کو اگر اچھے طریقہ سے پڑھ لیا جائے تو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں"

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۷۔ صفحہ ۱۶/۱۹)

اللہ اللہ! وہ نصابِ تعلیم جس میں "آٹے میں نمک برابر دین نہیں تھا"، اور جو علماء کی تمام خرابیوں کی جڑ تھا، کس طرح اب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کا واحد نصاب بن گیا حتیٰ کہ انہوں نے خود، اپنے ایک۔۔

جماعتِ اسلامی کی درسگاہِ درسِ نظامی کا اجراء

"انصاف پسند مفتی" کی زیرِ نگرانی راولپنڈی میں درسِ نظامی کی ایک درس گاہ کا اجراء کر دیا اس کے اجراء کے بعد تو علماء کو یقین ہو جائے گا کہ ان میں اور جماعتِ اسلامی میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رہی۔

انبیاء کے وارث

یہ مقالہ کافی طویل ہو چکا ہے۔ اس لئے زیادہ تفصیلات سے احتراز کرتے ہوئے ہم صرف ایک اہم نکتہ کی وضاحت کریں گے۔ حکمتِ عملی کی پالیسی سے پہلے جماعتِ اسلامی کی طرف سے علماء کو جس نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اس کی تفصیلات پیچھے گذر چکی ہیں۔ لیکن حکمتِ عملی کی پالیسی کے بعد انہی لوگوں کو "انبیاء کا وارث" کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ایشیا۔ اتحاد العلماء نمبر) صرف ایشیا کے اسی شمارے میں علماء کی شان میں یہ "حدیث" درجنوں مقامات پر دہرائی گئی ہے اور حد یہ ہے کہ صفحہ ۷ پر اس کا حوالہ بخاری شریف کا دیا گیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کا سارا قدیمی لٹریچر دیکھ جائیے، اس میں کہیں بھی علماء کو اس حدیث سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ائمہ حدیث کے اندر اس کی حیثیت کیا ہے۔ امام بخاری نے یہ الفاظ ضرور نقل کئے ہیں، لیکن اسے اسناد کے بغیر بیان کیا ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں: وذکرہ البخاری فی صحیحہ بغیر اسناد (نیل الاوطار، جلد ۶ صفحہ ۱۳۹)

علامہ شوکانی نے اس حدیث پر فنِ حدیث کی روشنی میں پوری بحث فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں:۔ اخرجہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن حبان من حدیث ابی الدرداءؓ۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان نے ابودرداء کی روایت سے بیان کیا ہے" (ایضاً) اور پھر اسکے ضعیف ہونے کے بارے میں محدثین کا یہ فیصلہ نقل کرتے ہیں۔ وضعفہ الدارقطنی فی العلل۔ دارقطنی نے "العلل" میں ابودرداء کو ضعیف راوی قرار دیا ہے۔ قال المنذری وھو مضطرب الاسناد۔ المنذری کا کہنا ہے کہ وہ مختلف احادیث کی اسناد میں گڑبڑ کرتا تھا" (ایضاً)

انکارِ حدیث کی خطرناک صورت

لیکن امیر جماعتِ اسلامی کو ائمہ حدیث کی تحقیقات اور فنِ حدیث کی بحثوں سے کیا واسطہ۔ انہوں نے تو ان تمام لاکھوں آئمہ حدیث کی کوششوں کو یک قلم موقوف کر کے، ردّ وقبولِ حدیث کے متعلق اپنے اصول وضع کر لئے ہیں جن کا دارومدار فنِ حدیث کی باریکیوں کے بجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "مزاج شناسی" پر ہے۔ ان کا یہ "اصول" انہی کی زبانی سنیئے۔

"جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ

نبی اکرمؐ کا مزاج شناس

کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکارؐ کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے یہ اس لئے کہ اس کی رُوح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے، مگر اس کے فیصلے کا دارومدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلّل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس کے جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔"

(تفہیمات از مولانا مودودی صاحب۔ جلد اوّل صفحہ ۲۹۶۔ مضمون مسلکِ اعتدال)

حرفِ آخر

ہم علماء کرام سے گذارش کریں گے کہ وہ غور فرمائیں کہ انکارِ حدیث کی اس سے زیادہ خطرناک اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کا دارومدار ایک فرد کا ذاتی فیصلہ قرار پا جائے۔

حکمتِ عملی کی پالیسی کے تحت جماعتِ اسلامی اپنے "اصولوں میں جو لچک" پیدا کر رہی ہے، بہت سے مسائل میں وہ ہمارے سامنے ہے۔ علماء کے بارے میں بھی اس نے اپنی اسی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ لیکن ان حضرات کو اس سے فریب میں نہیں آ جانا چاہیئے۔ یہ فیصلے تو حکمتِ عملی کے ماتحت، اپنی مصلحتوں کے تقاضوں کی رُو سے کئے جاتے ہیں۔ نہ معلوم کب انکی مصلحتیں بدل جائیں اور علماء کے متعلق یہ پھر وہی کچھ کہنے لگ جائیں جو کچھ یہ اس سے پہلے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ بے اصولی پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

مقدمہ بہاولپور (سنہ ۱۹۳۵ء)

(جس میں "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دیا گیا)

تحریک ختم نبوت کے ضمن میں مقدمۂ بہاول پور کا ذکر اکثر سننے میں آیا ہوگا۔ اس میں "احمدیوں" کو (غالباً) سب سے پہلے عدالتی طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ اس مقدمہ نے اس زمانے میں ملک گیر شہرت اختیار کر لی تھی، اور اس کے فیصلہ کی اشاعت بھی بکثرت ہوئی تھی۔ آخری مرتبہ یہ فیصلہ "محفل ارشاد، سیالکوٹ" کی طرف سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اب (غالباً) نایاب ہو چکا ہے۔ ہم نے خود کئی مرتبہ محفل ارشاد سیالکوٹ کو خطوط لکھے لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس مقدمہ کا فیصلہ پرویز صاحب کے ایک مقالہ کی بنیاد پر ہوا تھا اس لئے اس کے متعلق ہمیں اکثر استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس فیصلہ کی کاپی ہم بھی مہیا نہیں کر سکتے۔ اب بعض قارئین نے کہا ہے کہ اس کا جتنا حصہ پرویز صاحب کے مضمون سے متعلق ہے، کم از کم اسے ہی طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ زیرِ تعمیلِ ارشاد وہ حاضرِ خدمت ہے۔

اس مقدمہ کی مختصر روئداد یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک مسلمان خاتون نے، عدالت منصفی احمد پور شرقیہ میں دعویٰ دائر کیا کہ چونکہ اس کا خاوند احمدی (یعنی مرزائی) ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مسلمان نہیں رہا اس لئے اسے (مدعیہ کو) تنسیخ نکاح کی ڈگری دی جائے۔ یہ مقدمہ نو سال تک مختلف عدالتوں میں گردش کرتا رہا، تا آنکہ سنہ ۱۹۳۵ء میں خان محمد اکبر (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج ضلع بہاول نگر (ریاست بہاول پور) نے فیصلہ صادر فرمایا کہ مدعا علیہ، مرزائیت اختیار کر کے دائرہ اسلام سے خارج ہو چکا ہے۔ اس لئے مدعیہ کو تنسیخ نکاح کی ڈگری دی جاتی ہے۔

اس مقدمہ نے کسقدر اہمیت حاصل کر لی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مدعیہ کی طرف سے حسب ذیل جید علماء بطور گواہ پیش ہوئے تھے (۱) مولوی غلام محمد صاحب، شیخ الجامعہ، عباسیہ، بہاول پور (۲) مولوی محمد حسین صاحب سکنہ گوجرانوالہ (۳) مولوی محمد شفیع صاحب، مفتی دار العلوم، دیوبند (۴) مولوی مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری (۵) سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری (۶) مولوی نجم الدین صاحب، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور (فیصلہ ص ۵۳)

یہاں میں یہ درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں، اس لئے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کر سکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر

چیخ و پکار کی جا رہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کر دی جائے۔

مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف بیان نہیں کی گئی صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا رہا ہے اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے۔ اور نبی کے لئے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریق ثانی نے (بحوالہ ہدایات صفحہ ۹۸) بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجتا ہے۔ بخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے۔ کتاب لانے یا نہ لانے، رسول کے لئے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے کہ جو صاحب کتاب ہو۔ یا شریعت سابقہ کے بعض احکام کو منسوخ کرے۔

یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھیں اس لئے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی تعریف مل جائے جو تصریحات قرآنی کی رو سے تمام لوازم نبوت پر حاوی ہو۔ اس سلسلہ میں مجھے مولانا محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کی کتاب دین و آئین دیکھنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے معترضین کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے نبوت کی حقیقت یہ بیان کی کہ جس شخص کے دل میں کوئی نیک تجویز بغیر ظاہری وسائل اور غور کے پیدا ہو۔ ایسا شخص پیغمبر کہلاتا ہے اور اس کے خیالات کو وحی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ تعریف بھی مجھے دلچسپ معلوم نہ ہوئی۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان میکانیکی اسلام از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔[^1] اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقے کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں۔ کہ "آج کل کے معقولیت پسندوں کی جماعت کے نزدیک رسول کا تصور یہ ہے کہ وہ ایک سیاسی لیڈر اور ایک مصلح قوم ہوتا ہے۔ جو اپنی قوم کی نکبت اور زبوں حالی سے متاثر ہو کر انہیں فلاح و بہبود کی طرف بلاتا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اندر انضباط و ایثار کی روح پھونک کر زمین کے بہترین خطوں کا ان کو مالک بنا دیتا ہے اس کی حقیقت قوم کے ایک امیر کے قسم کی ہوتی ہے۔ جس کے ہر حکم کا اتباع اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ انحراف سے قوم کی اجتماعی قوت میں انتشار پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور وہ دنیاوی نعمتیں جو اس کے حسن تدبیر سے حاصل ہوئی تھیں ان کے چھن جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

اس کا حسن تدبر عقل و حکمت ذہن انسانی کے ارتقاع کی بہترین کڑی ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے ماحول کا بہترین مفکر شمار کیا جاتا ہے۔ کثرت ریاضت سے برائی کی قوتیں اس سے سلب ہو جاتی ہیں اور نیکی کی قوتیں نمایاں طور پر ابھر آتی ہیں انہی قوتوں کا نام ان کے نزدیک ابلیس اور ملائکہ ہے" اس کا جواب پھر انہوں نے بحوالہ آیات قرآنی یہ دیا ہے:۔ کہ "رسول بلاشبہ مصلح اور مدبر ملت ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت دنیاوی مصلحین اور مدبرین سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ دنیاوی مفکرین و مدبرین اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں ان کا فلسفۂ اصلاح و بہبود ان کی اپنی پرواز

---

[^1]: پرویز صاحب کا اتنا یاد پڑتا ہے کہ ان کا یہ مضمون ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کی کسی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔

نکر کا نتیجہ ہوتا ہے، جو کبھی صحیح اور کبھی غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے انبیاء کرام مامور من اللہ ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ اس دنیا میں خاص مشیتِ باری تعالیٰ کے تحت چلتا ہے۔ وہ نہ اپنے ماحول سے متاثر اور نہ احوال وظروف کی پیداوار ہوتے ہیں بلکہ ان کا انتخاب مشیتِ ایزدی سے ہوتا ہے اور ان کا سرچشمہ علوم وہدایت علم باری تعالیٰ ہوتا ہے جس میں کسی سہو وخطا کی گنجائش نہیں ہوتی ان کا سینہ علمِ لدنی سے معمور اور ان کا قلب تجلیاتِ ازلی سے منور ہوتا ہے۔

دنیاوی سیاست وتفکر صنعت ہے جو اکتسابًا حاصل ہوتی ہے اور مشق ومہارت سے یہ ملکہ بڑھتا ہے لیکن نبوت ایک موہبتِ ربانی اور عطائے یزدانی ہے جس میں کسب ومشق کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ جو امت کی ترقی ان کے بھی پیش نظر ہوتی ہے لیکن سب سے مقدم اخلاق انسانی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے اس کا پیغام زمان ومکان کی قیود سے بالا ہوتا ہے اور وہ تمام انسانوں کو راستہ دکھانے والا اور ان کا مطاع ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت میں خدا کی اطاعت اور اس کی معصیت خدا کی معصیت ہوتی ہے۔ اور جو لائحۂ حیات اس کی وساطت سے دنیا کو ملتا ہے اس میں کوئی دنیاوی طاقت ردوبدل نہیں کرسکتی بلکہ دنیا بھر کی عقول میں جہاں کہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ بھی اس کی مشعلِ ہدایت سے ہوسکتا ہے ان کو خدائی پیغام ملائکہ کی وساطت سے ملتے ہیں جو اگرچہ عالمِ امر سے متعلق ہونے کی وجہ سے سرحدِ ادراکِ انسانی سے بالاتر ہیں لیکن ان کا وجود محض انسان کی مفکرتی قوتیں نہیں ہیں"۔

فاضل جج نے مقدمہ کا پس منظر بیان کرنے کے بعد اپنے فیصلہ میں لکھا:۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ رسول اللہ وسلم کے بعد کسی دوسرے نبی کو تسلیم کرنے سے کیا قباحت لازم آئے گی تصریحاتِ قرآنی کی رُو سے نیا نبی مطاع ہو جائے گا اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکے گا اس کی ہر بات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا اور جو حکم دے گا اس کی تعمیل لازمی ہوگی ورنہ اعمال کے حبط ہونے کا اندیشہ ہوگا۔ اس کی شان میں ذرہ بھر گستاخی نہیں کی جاسکے گی بلکہ اس کے سامنے اونچا بولنا بھی گناہ ہوگا اس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہوگی اور اس سے روگردانی ایمان سے خارج ہونے کا باعث اور موجب عذاب الٰہی ہوگی۔

پرویز صاحب کی۔۔ تصریحات کی بنیاد پر فاضل جج نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ:۔

مدعاعلیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہوچکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح۔ تاریخ ارتداد مدعاعلیہ سے فسخ ہوچکا ہے۔

مرتبہ محمد اسلام، نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام، کراچی

نگہِ بازگشت

رہگزرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل

(قسط چہارم)

اس کی پہلی تین قسطیں طلوعِ اسلام بابت جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

تحریکِ پاکستان کا مقصد و منتہا کیا تھا؟ اس میں کش مکش کیا تھی اور کن کن کے درمیان تھی، طلوعِ اسلام اس کی وقتاً فوقتاً یاد دہانی کراتا رہتا ہے۔ یہ یاد دہانی اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس تحریک اور مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں جن سے مقصد یہ ہے کہ اس تحریک و مطالبہ کا حقیقی مفہوم ہماری نئی نسل کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آج تک نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی صحیح اور مستند تاریخ مرتب کی ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات۔ سرِ دست یہ تاریخ اس دور کے طلوعِ اسلام کی فائلوں میں محفوظ ہے۔ اسی سے آپ اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ پاکستان میں جو کچھ تحریکِ پاکستان، یا قائدِ اعظمؒ اور اقبالؒ کے (البتہ فریب) نام سے کیا جا رہا ہے کس طرح کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں طلوعِ اسلام یا پرویز صاحب کا نام نہ آنے پائے۔ یہ اس لئے کہ یہ حضرات چاہتے ہی نہیں کہ اس دور کی صحیح تاریخ سامنے آئے۔ آنے والا مورخ اس حقیقت سے پردہ اٹھائے گا کہ جو کچھ طلوعِ اسلام نے کہا تھا اس کا تذکرہ کئے بغیر تحریکِ پاکستان کی تاریخ نہ صرف ناتمام رہ جاتی ہے، بلکہ مرتب ہی نہیں ہو سکتی۔

جمعہ کی تعطیل

ہفتہ میں ایک دن کاروبار بند رکھنا، یہودیوں کا تو "دینی تقاضا" ہے اسلام میں ایسا نہیں۔ ہمارے ہاں یہ قومی سوال ہوگا۔ ہمارا جی چاہے تو ایک دن کاروبار بند رکھیں، نہ چاہے نہ رکھیں۔ اس کے لئے دن کا تعین بھی یہودیوں میں عقیدۃً ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بھی نہیں۔ ہم اپنی معاشرتی مصلحت کے تحت جو دن چاہیں مقرر کر لیں۔ جہاں تک جمعہ کا تعلق ہے قرآنِ کریم تو اس دن کاروبار کا ذکر کرتا ہے (بلکہ ایک

معنوں میں حکم دیتا ہے۔ سورۂ جمعہ میں ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ (۶۲/۹) اے جماعتِ مومنین! جب تمہیں صلوٰۃ الجمعہ کے لئے پکارا جائے تو تم کاروبار چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف لپک کر آ جایا کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے کے مسلمان قبل از صلوٰۃ جمعہ کاروبار میں مصروف رہتے تھے جبھی تو ان سے کہا پڑا کہ کاروبار کو چھوڑ کر صلوٰۃ کے لئے آ جایا کرو۔ اس کے بعد ہے فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۶۲/۱۰) جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو تم تلاشِ معاش میں ادھر ادھر (جہاں جی چاہے) نکل جاؤ۔ اس سے واضح ہے کہ وہ بعد از صلوٰۃ بھی کاروبار کرتے رہتے تھے بلکہ (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہاں کاروبار کی تاکید پائی جاتی ہے لہٰذا قرآنِ کریم کی ان تصریحات کے مطابق جمعہ کے دن صرف صلوٰۃ جمعہ کے لئے کاروبار بند کرنے کا حکم ہے باقی وقت نہیں۔

بالفاظِ دیگر ہماری اسلامی کونسل نے غیر سے ایک سفارش کی ہے اور وہ بھی قرآنی صراحت کے خلاف ہے۔

(طلوعِ اسلام اگست ۸۵ء، ص۹)

غیر شائستہ، فحش اشتہارات اور رقص پر پابندی

یہ سفارش بھی معقول اور برمحل ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے فحش اشتہارات اور تصاویر تک ہی کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس ذریعہ اور سبب پر ہونا چاہیئے جو جنسی جذبہ میں انگیخت، ہیجان یا اشتعال پیدا کرے۔ فحش اشتہارات و تصاویر تو اس کی پیش پا افتادہ اور عریاں سی شکلیں ہیں۔ جس قسم کا عریاں لٹریچر ہمارے ہاں شائع ہو رہا ہے —— وہ نثر میں ہو یا نظم میں، وہ غیر ممالک سے درآمد شدہ ہو یا خود اپنے یہاں کی تخلیق۔ اس پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔ اور پھر اس پر سختی سے عمل ہونا چاہیئے۔ ہمارے معاشرہ میں جنسی ہیجانات سیلاب کی طرح امڈے چلے آ رہے ہیں اور اس کا سدِّباب حکومت کا اوّلین فریضہ ہونا چاہیئے۔ نظریاتی کونسل کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس باب میں ان سفارشات سے کہیں زیادہ جامع اور مؤثر سفارشات کرتی۔

لیکن ان ظواہر سے کہیں زیادہ تخریب کار اور فساد انگیز وہ بواطن ہیں جو جنسی ہیجان کے محرک ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق نفسیات سے ہے۔ لہٰذا جب تک ہمارے نوجوان طبقہ میں صحیح نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، معاشرہ میں فحاشی کا سدِّباب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر اصلاحی کوششوں کی مثال وہی ہے جسے ہم پہلے بھی پیش کر چکے ہیں۔ یعنی اس پودے کے پتوں پر پانی چھڑکنا جس کی جڑ کرم خوردہ ہو۔ اسی بنا پر قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (۷/۳۳) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے ظاہر و باطن فواحش، دونوں کو حرام قرار دیا ہے"۔ کونسل کے لئے ضروری تھا کہ فحش کے باطنی محرکات کی تحقیق کرتی اور ان کی اصلاح کی سفارشات پیش کرتی۔ کرنے کا اصلی کام تو یہی تھا۔ فحش اشتہارات کی ممانعت کے لئے نہ کسی نظریاتی کونسل کی ضرورت تھی نہ اسلامی تحقیقاتی ادارہ کی۔ یہ تو پیش پا افتادہ موضوع ہے جس کا ہر جگہ چرچا ہوتا رہتا ہے۔ (اگست ۸۵ء، ص۱۰)

اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل

نظریاتی کونسل نے طویل مدت کے بعد جو سفارشات پیش کیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی اگست ۸۵ء کی اشاعت میں لکھا:

یہ ہیں وہ سفارشات جو نظریاتی کونسل نے مرتب کی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان میں بیشتر ایسی ہیں جن کا دین سے براہِ راست کچھ تعلق نہیں۔ وہ قومی شعائر سے متعلق ہیں۔ جن سفارشات کا دین سے براہِ راست تعلق ہے وہ بھی ضمنی اور فرعی حیثیت رکھتی ہیں اور "پکی روٹی" والے واعظوں کی طرف سے صبح و شام پیش ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کسی کا تعلق دین کی اساس و اصول سے نہیں۔ اس وقت ہمارا معاشرہ بڑی برق رفتاری سے تباہی اور بربادی بلکہ جہنم کی طرف بڑھے چلا جا رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بنیادی نظریات نگاہوں سے اوجھل ہو چکے اور گم کئے جا رہے ہیں جن کے تحفظ و استحکام کے لئے یہ مملکت وجود میں آئی تھی۔ ان نظریات کے الفاظ تو دن رات دہرائے جاتے ہیں، لیکن ان کا متعین مفہوم کسی کے سامنے نہیں۔ کونسل کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان نظریات کا مفہوم متعین کرے اور اس کی روشنی میں بتلائے کہ ان پر عمل پیرا کس طرح ہوا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بتلائے کہ جسے نظریہ پاکستان کہا جاتا ہے وہ ہے کیا اور دو قومی نظریہ کا مفہوم و مقصود کیا ہے۔ اور وہ کون سی دو قومیں ہیں جو پاکستان میں آباد ہیں۔

نظریات سے آگے بڑھیے تو قوم کے سامنے بنیادی مسائل آتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم معاشی مسئلہ ہے جس نے قوم میں عجیب و غریب الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایک گروہ سوشلزم ہی کو اسلام قرار دے رہا ہے۔ دوسرا گروہ تنہا سوشلزم نہیں بلکہ اسلامی سوشلزم کا داعی ہے۔ نہ سوشلزم کا داعی بتاتا ہے کہ وہ ازم ہے کیا اور کس طرح عین مطابقِ اسلام ہے۔ نہ اسلامی سوشلزم کے مدعی بتاتے ہیں کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے اور انہیں (سوشلزم کے ساتھ) لفظِ اسلام کے اضافہ کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ تیسری طرف ہمارے مدعیانِ اسلام کا گروہ ہے جو سوشلزم کو کفر اور اسلامی سوشلزم کو اس کفر کا فریب انگیز نقاب قرار دے کر دونوں کو ملعون ٹھہراتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس مسئلہ کا واحد حل اسلام کا معاشی نظام ہے لیکن اس نے بھی آج تک یہ نہیں بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا جو انسانیت کے دکھوں کا واحد مداوا ہے۔ کہنے پر وہ زیادہ سے زیادہ "زکوٰۃ" اور صدقات کے الفاظ دہرا دیتا ہے لیکن نہ دلائل و براہین سے یہ واضح کرتا ہے کہ یہ نظام کس طرح سوشلزم سے افضل و اعلیٰ ہے اور نہ ہی اعداد و شمار سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس سے کس طرح قوم کے معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس وقت ساری قوم اس الجھن میں گرفتار ہے کہ معیشت اس کی دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ اسلامی کونسل اور تحقیقاتی ادارہ کا اوّلین فریضہ تھا کہ وہ اس (اور اس قسم کے دیگر بنیادی مسائل) کے متعلق قوم کی رہنمائی کرتے اور واضح اور متعین طور پر بتاتے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح اقتصادی مسائل کا واحد اور اطمینان بخش حل ہے لیکن ان اداروں کی حالت یہ ہے کہ یہ کوٹ پتلون کی جگہ قمیض شلوار کی سفارش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے قوم کی مشکلات کا اسلامی حل دریافت کر لیا۔ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سوال پر کبھی (SERIOUSLY) غور ہی نہیں کیا۔ (یا اس کا احساس ہی نہیں کیا) کہ ان کی ذمہ داری کیا ہے اور فرائض کیا؟ انہوں نے بھی باقی قوم کی طرح دفع الوقتی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اگر انہیں اپنے فرائض کا (SERIOUSLY) احساس ہوتا تو اس تیرہ چودہ سال کے عرصہ میں وہ قوم کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیتے اور اس کی علمی اور تحقیقاتی متاع میں ایسا اور اس قدر اضافہ کر دیتے جسے ہم دنیا کے سامنے فخر سے پیش کر سکتے۔ اس وقت (کم از کم ہم تو) اس احساس کے بوجھ سے دبے چلے جا رہے ہیں کہ کونسل کی ان سفارشات کو دیکھ کر دنیا کے اربابِ فکر و نظر کیا کہیں گے کہ یہی تھا وہ اسلام جس کے احیاء کے لئے انہیں ایک جداگانہ، آزاد مملکت کی ضرورت لاحق ہوئی تھی....؟

اسلامی نظامِ تعلیم

مشاورتی کونسل کی سفارشات میں کہا گیا ہے کہ ملک میں اسلامی نظامِ تعلیم رائج کیا جائے۔ اسلامی تاریخ کی تعلیم دی جائے۔ حکومت تبلیغ کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اذان نشر کی جایا کرے۔ ربٰو کو ختم کر کے زکوٰۃ کا نظام رائج کیا جائے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی ستمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں لکھا کہ ان سفارشات میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے، وہ بڑے مقدس اور خوش آئند ہونے کے باوجود نئے نہیں وہ نہیں ہم گذشتہ پچیس، چھبیس سال سے مسلسل سنتے چلے آرہے ہیں، لیکن ان پر عمل پیرا ہونا تو ایک طرف ان کا مفہوم بھی آج تک متعین نہیں ہو سکا۔ مثلاً آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اسلامی نظامِ تعلیم ہوتی کیا ہے۔ اگر وہ وہی ہے جو سکولوں، اور کالجوں میں "اسلامیات" کے نام سے رائج ہے تو اس سے سیکولر نظامِ تعلیم کہیں بہتر ہے۔ اُس تعلیم میں طالب علم صحیح اسلام سے بے گانہ تو رہتا ہے، لیکن اس سے متنفر نہیں ہوتا۔ "اسلامیات" دین سے نفرت اور اسلام سے برگشتگی پیدا کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے۔

اسلامی تاریخ کی تعلیم

یہی کیفیت اسلامی تاریخ کی ہے۔ اگر اسلامی تاریخ اُسی کا نام ہے جو "خلافت و ملوکیت" اور اسی جیسی دوسری کتابوں میں بیان کی جاتی ہے تو اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا قوم کو اس کے شر سے محفوظ رکھے۔ یاد رکھئے! جو کچھ ہماری تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے ——— خواہ وہ متقدمین کی ہوں یا ان پر متفرع متاخرین کی۔ وہ ذہنوں میں اسلام کا رہا سہا تصور بھی ختم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ جب تک آپ (کم از کم) صدرِ اوّل کی تاریخ قرآن کریم کی روشنی میں از سرِ نو مرتب نہیں کریں گے، آپ اسلام کی صحیح تصویر کبھی سامنے نہیں لا سکیں گے۔

تبلیغ کی ذمہ داری

جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے۔ آپ پہلے یہ تو متعین کیجئے کہ وہ اسلام ہے کونسا۔ جس کی تبلیغ کی ذمہ داری آپ حکومت پر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ہر فرقہ کا اسلام الگ الگ ہے؛ اور الگ الگ ہی نہیں، ایک دوسرے سے ایسا متضاد اور متخالف کہ اس کی بنا پر اس کے علمبرداروں میں آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ یہی کیفیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اذان کے نشر کرنے کی سفارش کی ہے..... سوال یہ ہے کہ کونسی اذان اور وہ کس وقت نشر کی جائے گی؟ آپ کسی ایسے محلہ میں تشریف لے جائیے جہاں مختلف فرقوں کی مساجد اور ان کے میناروں پر لاؤڈ سپیکر نصب ہوں۔ نمازوں میں مغرب کی نماز کا وقت سب سے مختصر ہوتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ سنّی اور شیعہ، اور پھر سنیوں میں اہلحدیث اور اہلِ فقہ کی اذانوں کے اوقات میں کس قدر فرق ہے۔ جہاں تک اذان کے الفاظ کا تعلق ہے، پہلے شیعوں اور سنیوں کی اذان میں فرق ہوتا تھا اب خود سنیوں کی بعض مساجد سے ایسی اذان نشر ہونے لگ گئی ہے جس میں اذان سے پہلے ایسے الفاظ پکارے جاتے ہیں، جو خود سنیوں کے دوسرے فرقوں کی اذان میں نہیں ہوتے۔

ربٰو کو ختم کر کے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے

سب سے اہم سفارش ربٰو کو ختم کر کے زکوٰۃ کے نظام کا قائم کرنا ہے اور یہی سفارش اہلِ فکر اصحاب کی توجہ کی زیادہ متقاضی ہے۔ ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ جب بھی معاشی نظام کا ذکر آتا ہے تو مذہبی حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اسلام کا خود ایک معاشی نظام ہے جو تمام اقتصادی مصائب کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جس طرح آج تک صومِ صلوٰۃ کے

ئے مودودی مرحوم کی تاسّف انگیز کتاب

مدعیوں نے یہ نہیں بتایا کہ سوشلزم کہتے کسے ہیں یا سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے۔ اسی طرح مذہبی حلقوں نے بھی کبھی یہ نہیں بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا جو تمام اقتصادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ بس رٹا کر یہ الفاظ بار بار دہرائے جائیں گے کہ اس میں ربوٰ کو ختم —— اور زکوٰۃ کے نظام کو رائج کیا جائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم بھی آج تک کسی نے نہیں بتایا۔ ربوٰ کا ترجمہ سود کر دیا جاتا ہے اور سود سے ذہن لامحالہ اس بیاج کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو سودی قرضوں پر ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ سے ذہن اس اڑھائی فیصد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے سال کے بعد خیرات کے طور پر بانٹ دیا جاتا ہے۔ نظامِ زکوٰۃ سے عام مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ اس اڑھائی (یا کچھ اور فیصد) روپے کو منظم طور پر جمع کیا جائے اور اسے حکومت ان مصارف پر خرچ کرے جو قرآن میں مذکور ہیں حالانکہ وہ مصارف بھی "صدقات" کے ہیں زکوٰۃ کے نہیں۔

اسلامی مشاورتی کونسل کی سفارشات پر تبصرہ کرنے کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا کہ:

آج اسلام زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ اور غیر تو غیر، خود ہماری اپنی نئی نسل کے نوجوان (شاید آخری بار) یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ واقعی نوعِ انسان کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے یا ہم محض اپنے مقدس جذبات کی رو سے بلا سوچے سمجھے ایسا کہتے چلے آ رہے ہیں۔ پاکستان وہ کسوٹی تھی جس پر اسے کسا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو یہ بڑا اہم موڑ ہے جس پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اور بڑا ہی نازک مرحلہ، جس میں ہم قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت دنیا کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں، یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ اسلام کی مدعی مملکت کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتی ہے۔ ہم اسلامی مشاورتی کونسل کے ذمہ دار ارکان سے با ادب دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ کیا انہوں نے معاشیات سے متعلق تمام گوشوں کو سامنے رکھ کر اعداد و شمار کی رو سے یہ دیکھ لیا ہے کہ ایسا نظام جزوی طور پر تا کُلّی ممکن بھی ہے جس میں ربوٰ کو ختم کر دیا جائے، اور کیا اس کے ختم کرنے اور زکوٰۃ کا روپیہ حکومت کی زیرِ نگرانی اکٹھا کرنے سے وہ معاشی نظام قائم ہو جائے گا جو ہماری تمام اقتصادی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھے گا؟ یہ اس لئے کہ اگر یہ نظام اس قسم کے نتائج پیدا نہ کر سکا، فلہٰذا ناکام رہا، تو یہ محض اسلامی مشاورتی کونسل کی کسی سفارش کی ناکامی نہیں ہوگی، دنیا اسے خود اسلام کی ناکامی تصور کرے گی اور یہ اتنا بڑا نقصان ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔ کیا یہ سفارش کرتے وقت اسلامی مشاورتی کونسل نے اس عظیم ذمہ داری کے وزن کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا ہے؟ یا محض حکومت کو "رپورٹ" بھیجنے کے فریضہ سے رسمی طور پر سبکدوش ہونے کی خاطر یہ الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں......؟　　(اکتوبر ۱۹۷۵ء، صٓ)

آتش برداروں کی خدمت میں

پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اپنے ایک خطاب میں جس کا عنوان تھا "قوموں کی تعبیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں"—— کہا تھا کہ،

تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلابِ بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی

طرح محکم چلی آ رہی تھیں اس لئے مملکتِ پاکستان، جو ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی۔ جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو ہم نے ان آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ ان کو قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں مسٹر گاندھی نے (QUIT INDIA) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بیباک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو بھی دعوت دی تھی کہ جب انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیں یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھائیے، قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ انگریز کی طرف ہے کل کو اس کا رخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بس میں بھی نہیں رہے گا۔ یہی کچھ ہم نے اپنے ہاں کے لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے، اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتشیں پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ ہم نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی۔ لیکن قوت کے نشہ میں مدہوش اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے ہیں اور حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے۔

؎ جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے — جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (LAW - LESSNESS) کی لپیٹ میں آ رہا ہے۔

یہ جولائی ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ اس کے بعد طلوعِ اسلام مسلسل (وقتاً فوقتاً) اس موضوع پر لکھتا رہا اور ان سے کہتا رہا کہ اگر آپ کو اس کا احساس نہیں کہ لاقانونیت سے ملک کی بنیادیں کس قدر متزلزل ہو رہی ہیں، تو کم از کم اتنا ہی سوچئے کہ خود آپ کو اس کا کس قدر سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟ لیکن یہ اپنی تخریب کاریوں میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے تا آنکہ "خدا کا عذاب" ان پر ان راہوں سے آ گیا، مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۶/۲۶﴾۔ جن کا انہیں سان گمان بھی نہ تھا۔ قانونِ مکافات کی کارفرمائی کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ ظالمین کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر مسلط ہو جاتا ہے تاکہ وہ انہیں ان کی دھاندلیوں کا مزہ چکھائے۔ ان حضرات کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ خدا کے قانونِ مکافات پر ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کے سریع الحساب ہونے کا بھی تصور رکھتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے تھے کہ اس کی "سریع الحسابی" کی رفتار اس قدر تیز ہوگی کہ ہنوز ایوانِ اقتدار سے ان حضرات کے ناموں کی تختیاں بھی نہ اتری ہوں گی کہ ان کا مؤاخذہ شروع ہو جائے گا اور دنیا پکار اٹھے گی کہ،

؎ دیدی! کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را — چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

تفویض کا عقیدہ کلیسا کا وضع کردہ ہے

سابق وزیراعظم (پاکستان) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو ایک مذہبی بل پر بحث کرتے ہوئے سینٹ میں ایک

تقریر کی۔ جس کی اہمیت کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے اسے اپنے صفحات میں منضبط کر لیا۔ موصوف نے فرمایا:-

"حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو حاصل ہے لیکن اس دنیاوی ماحول میں یہ حاکمیت انسانوں کو بھی تفویض کی گئی ہے اور اس کی حاکمیت اور خود مختاری کو، پارلیمنٹ میں، لوگوں کی طرف سے ان کے منتخب نمائندے استعمال کرتے ہیں۔ . . . . . حقیقی احکم الحاکمین اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حاکمیت عوام کو تفویض کی گئی اور عوام نے وہ مقننہ کو سونپ دی اور اس کے عمل سے وہ اللہ تعالیٰ سے انسانوں تک پہنچی اور پھر عوام کے نمائندوں کو ملی اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکمیت مقننہ کی ہے"۔ (نوائے وقت لاہور ۹ ستمبر ۱۹۷۷ء)

طلوعِ اسلام نے اپنی اکتوبر ۷۷ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:-

محترم وزیرِاعظم نے اس تقریر میں جو بنیادی نکتہ پیش کیا ہے ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے جس کا ازالہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ وہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم اور خدائے تعالیٰ کے حقیقی تصور کے خلاف ہے اور اس کے نتائج بہت دور رس ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے، اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو تفویض (DELEGATE) نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ رسولوں کو بھی نہیں۔ رسول بھی اس کے عبد ہوتے تھے یعنی احکامِ خداوندی کے مطیع اور محکوم۔ جو اتھارٹی اپنے کسی اختیار کو کسی دوسرے کو تفویض کر دیتی ہے، وہ اس وقت تک، جب تک وہ اس تفویض کردہ اختیار کو واپس نہ لے لے، اس اختیار سے عاری رہتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ اپنے اختیارات کو انسانوں (عوام) کو سونپ کر، خود ان اختیارات سے (وقتی طور پر ہی سہی) عاری اور محروم ہو چکا ہے، باطل ہے۔ قرآنِ کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ اس نے تمام انسانوں کو خدا کے احکام کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

تفویض (DELEGATE) کا عقیدہ درحقیقت کلیسا (CHURC) کا وضع کردہ ہے جس کی رُو سے اس نے اپنے آپ کو خدائی اختیارات کا حامل قرار دے دیا۔ اس سے تھیاکریسی کی بنیاد پڑی اور ارباب کلیسا نے، خدا کے نام پر، انسانوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے:

قرآن کریم کی رُو سے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ سوال سارا انسان کا اپنے ان اختیارات کے استعمال کا ہے۔ خدا سے انکار کرنے والے، ان اختیارات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اسے سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ جس کی عملی شکل مغرب کا نظام جمہوریت ہے۔ اس نظام میں عوام کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ (مقننہ) جس قسم کے بھی چاہے آئین و قوانین بنا سکتی ہے اس پر اس ضمن میں کسی قسم کا کنٹرول یا پابندی نہیں ہوتی وہ اختیاراتِ مطلق کی حامل (SOVEREIGN) ہوتی ہے۔

لیکن خدا پر ایمان رکھنے والے، اپنے اختیارات کو بلا حدود و قیود استعمال نہیں کر سکتے انہیں ان اختیارات کو خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ (یہ حدود خدا کی کتاب میں درج ہیں اور ابدی اور غیر متبدل ہیں) اسے اسلامی نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں، مقننہ کے قانون سازی کے اختیارات، مطلق (ABSOLUTE) یا غیر محدود نہیں ہوتے۔ ان پر حدود اللہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی خصوصیت جس کی رُو سے اسلامی جمہوریت، مغربی جمہوریت یا سیکولرازم سے متمیز اور مختلف ہوتی ہے یعنی انسانی دنیا میں (SOVEREIGNTY) قائم و دائم رہتی ہے۔ (اکتوبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۶)

طاقت کا سرچشمہ کون ہے؟

پیپلز پارٹی نے اپنے سابقہ تین "سلوگنوں میں" ایک اور کا اضافہ کیا ہے اور وہ ہے "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں"۔ اقامتِ دین کے مدعیوں کی طرف سے اس پر اعتراض ہوا ہے کہ ایسا کہنا شرک ہے۔ طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے اس نعرہ کی سند کیا ہے اور مذہبی پیشوائیت کے اس دعویٰ کی حقیقت کیا؟

اس کا جواب دیتے ہوئے طلوعِ اسلام نے جولائی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں لکھا:۔

یورپ میں پہلے نظامِ ملوکیت رائج تھا جس میں طاقت کا سرچشمہ ایک فرد، یعنی بادشاہ ہوتا تھا۔ کلیسا نے اس کی جگہ لی تو دعویٰ کیا کہ طاقت کا سرچشمہ خدا ہے لیکن اس نے یہ طاقت ہمیں تفویض کر دی ہے کیونکہ ہم خدا کے نائب ہیں۔ اس طرح طاقت کا سرچشمہ پھر بھی انسان ہی رہے، لیکن ایک مقدس نقاب اوڑھے ہوئے اسے تھیاکریسی کہتے ہیں۔ اس تصور کے خلاف فرانس میں انقلاب برپا ہوا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں جو ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ہاتھوں بروئے کار آتی ہے۔ اس کا نام نظامِ جمہوریت ہے جب ہمارے ہاں نظامِ جمہوریت کو اپنایا گیا تو یہ تصور بھی فطری طور پر اس کے ساتھ آیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یہ ہے پیپلز پارٹی کے اس سلوگن کی سند۔

اقامتِ دین کے مدعیوں کی طرف سے جو نعرہ بلند ہوا وہ بظاہر بڑا مقدس نظر آتا ہے (کہ طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں خدا ہے) لیکن اگر آپ ذرا بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ نعرہ محض فریقِ متقابل کی مخالفت کے لئے ابھارا گیا ہے۔ ورنہ ان کے نزدیک بھی درحقیقت طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہیں۔ اس کا بیّن ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ پیپلز پارٹی کا دعویٰ ہے کہ عوام کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی اور انہوں نے ہمیں اکثریت میں ووٹ دیئے تھے۔ متحدہ محاذ والوں کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ عوام کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ پیپلز پارٹی نے دھاندلی سے ووٹوں کی اکثریت اپنی طرف دکھا دی اور اس کا ثبوت ہمارے جلسے، جلوس، ہنگامے، مظاہرے بہم پہنچاتے ہیں جن میں عوام اس کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا مطالبہ یہ ہے کہ انتخابات از سرِ نو کرائے جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ عوام کی اکثریت کس کے ساتھ ہے! آپ نے دیکھا کہ اسلام کے مدعی حضرات بھی وہی کچھ مانتے اور کہتے ہیں جو پیپلز پارٹی والوں کا دعویٰ ہے، کہ طاقت کا سرچشمہ عوام کی اکثریت ہے۔ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اگر (جیسا کہ آپ کہتے ہیں) طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے، عوام نہیں، تو پھر آپ عوام کی اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی کیوں لگا رہے ہیں؟

بات یہ ہے کہ غیر آئینی نظام میں طاقت کا سرچشمہ براہِ راست عوام ہوتے ہیں۔ وہ ہنگامہ آرائی اور ہلڑ بازی سے اپنی من مانی کر لیتے یا کرا لیتے ہیں لیکن آئینی نظام میں طاقت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے۔

مغربی نظامِ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہوتا ہے، اس لئے طاقت بالواسطہ انسانوں ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس تصور کی جڑ کاٹ دی کہ طاقت کا سرچشمہ انسان ہوتے ہیں، خواہ وہ انسان ایک فرد ہو، ایک جماعت ہو یا عوام ہوں۔ اس نے کہا کہ طاقت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے لیکن قانون سازی کا حق اور اختیار انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ قوانین خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں "کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہے"۔ انسانوں کی دنیا میں یہ قوانین جو خدا کی کتاب میں محفوظ ہیں، نظامِ مملکت کی رُو سے نافذ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نظام ان قوانین کی قوت کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتا ہے اسے از خود کوئی طاقت حاصل نہیں ہوتی ان قوانین کے ضابطہ کو الکتاب کہہ کر پکارا گیا ہے —— قرآنی حکومت۔

کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ طاقت قاطبۃً خدا کی کتاب میں دیئے گئے قوانین کو حاصل ہوتی ہے اور حکومت یا مملکت ان قوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ یا ایجنسی ہوتی ہے اور ایک حکومت کی ایک تیسری قسم ہے اور وہ ہے تھیاکریسی جس میں طاقت، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

پاکستان اور جمہوریت

نظامِ جمہوریت اور قرآنی نظام کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اگست سنہ ۱۹۷۷ء (ص۴۵) کی اشاعت میں لکھا تھا۔

اس کے بعد آپ خود اندازہ لگائیے کہ قرآنی نظام کی عمارت کن اصولوں پہ استوار ہوتی ہے اور کیا مغرب کے جمہوری نظام کو کسی صورت میں بھی اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ اسے اسلامی کہنا تو ایک طرف، وہ اسلام کی نقیض ہے۔ اس کی ضد ہے۔ اس میں کہیں خدا نہیں آتا، وحی نہیں آتی، وحی پہ مبنی مستقل اصول نہیں آتے، غیر متبدل اقدار نہیں۔ وہ دہریت یعنی سیکولر نظام ہوتا ہے اسے اسلام سے کیا واسطہ۔

کہا یہ جائے گا کہ ہم نے اپنے ہاں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ مملکت اپنا کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ ہمارے ہاں کی جمہوریت ان شرائط سے مشروط ہے اس لئے یہ اسلامی ہے۔

لفظی طور پر تو یہ صحیح ہے لیکن عملاً اس کی حقیقت کیا ہے اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مرکزی اسمبلی میں یہ سوال زیرِ بحث آیا کہ جب کوئی مسودۂ قانون پارلیمان کے زیرِ غور آئے گا تو اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اور حدود اللہ کے اندر مقید ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ تجویز کیا گیا کہ اس کا فیصلہ اسلامی مشاورتی کونسل کریگی لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ آئین میں اس کونسل کی حیثیت محض مشاورتی رکھی گئی ہے تو اس مقصد کے لئے کسی اور اتھارٹی کی تلاش ہوئی۔ تجویز کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کو اتھارٹی قرار دے دیا جائے۔ ان تجاویز کے جواب میں صدرِ مملکت نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی تجویز بھی اختیار کی جائے اس سے پارلیمان کی (SUPREMACY) باقی نہیں رہتی اور یہ چیز اصولِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آئین کو ان شرائط سے مشروط کرنے کے باوجود جمہوریت اسلامی نہیں بن سکی۔ اس کا تصور مغربی ہی رہا جس کی رو سے (SUPREMACY) پارلیمان کے اراکین کی اکثریت کو حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ کسی خاص ذہن کا تصور نہیں اس کی وجہ ڈیماکریسی (جمہوریت) کا بنیادی تصور ہے۔

(DEMOCRACY) میں (CRACY) حکومت (DEMO) یعنی عوام کی ہوتی ہے جس طرح (AUTOCRACY) میں (CRACY) یعنی ایک شخص کی ہوتی ہے۔ اسلام میں (CRACY) نہ ایک شخص کی ہو سکتی ہے نہ عوام کی۔ اس لئے اسلامی نظام نہ ڈیموکریسی ہو سکتا ہے نہ آٹوکریسی۔ اس میں (CRACY) کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جو دنیا میں کہیں اور موجود نہیں۔ اور تھیاکریسی کی اصطلاح بھی اس مفہوم کی حامل نہیں اس لئے وہ بھی خلافِ اسلام ہے۔ اسلامی تصورِ حکومت اور نظامِ مملکت بالکل منفرد ہے اس لئے اس کے لئے اصطلاح بھی اپنی اور منفرد ہونی چاہیئے۔ مفہوم کے اعتبار سے اسے ..... (QURANO-CRACY) کہہ لیجئے۔ (اگست ۷۷ء صفحہ ۴۴)

مملکتِ پاکستان کی حفاظت

جمہوریت کا بنیادی تصور پیش کرنے کے بعد اپنی اسی اشاعت میں طلوع اسلام نے لکھا۔

آخر میں، ہم اتنی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ جو مملکت بھی خدا کی حاکمیت کا اقرار کرے اس کی سرزمین کی حفاظت مسلمان کا دینی فریضہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ اگر وہ خطۂ زمین محفوظ رہے گا تو خدا کی حاکمیت، کے دعویٰ کے عملی صورت اختیار کرنے کا امکان ہوگا۔ لیکن اگر وہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو خدا کی حاکمیت قائم کہاں ہو سکے گی؟ آج کوئی مسلمان اسپین کی سرزمین میں خدا کی حاکمیت کا نام تو لے کر بتلائے! اس لئے کوئی سکیم یا کوئی تحریک، جس کا نتیجہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اس خطۂ زمین کی سالمیت کا کمزور ہو جانا ہو، پاکستان اور اسلام دونوں کے خلاف غداری ہے۔ اس کے برعکس مستحق صد مبارکباد ہیں وہ جو اس کی حفاظت کے لئے کوشاں ہوں۔

کلچر یا اسلامی کلچر

کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف خطوں میں بسنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہے اس لئے ان کی قومیتیں مختلف ہیں۔ کلچر کا لفظ ایسا ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ کلچر کے مدعیوں سے پوچھئے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں متعین طور پر کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔ بات سمٹ سمٹا کر خوراک، لباس، تراش خراش، وضع قطع، طرزِ بود و ماند، یا فنونِ لطیفہ پر آجائے گی ان "دانشوروں" کو کون بتلائے کہ جو اسلام، وطن، نسل یا زبان کے اختلاف کو بھی جداگانہ قومیت کا معیار قرار نہیں دیتا کیا وہ وضع قطع، تراش خراش یا شعر و نغمہ کے اختلاف کو معیارِ قومیت تسلیم کر لے گا۔ قرآن کریم، اختلافِ رنگ اور زبان (الوان والسنہ) کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انہیں معیارِ قومیت قرار نہیں دیتا۔ اس نے جماعتِ واحدہ تشکیل کی تھی اس میں عرب، ایران، شام، عراق، روم، مصر، شمالی افریقہ، حبش وغیرہ کے باشندے سب شامل تھے جن میں اسلام لانے سے پہلے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ اسلام نے ایمان کو قدرِ مشترک قرار دیا تو ان اختلافات کے باوجود وہ سب ایک امت کے افراد بن گئے، حالانکہ اس وقت بھی ان کا طرزِ بود و ماند (بقول ان حضرات کے ان کا کلچر) الگ الگ تھا۔ اسلام طرزِ بود و ماند کو نہ چنداں اہمیت دیتا ہے نہ ہی اس سے تعرض کرتا ہے۔ مختلف ملکوں کے مسلمان اپنا طرزِ بود و ماند الگ الگ رکھ سکتے ہیں لیکن اس اختلاف سے وہ الگ الگ قومیتوں میں نہیں بٹ جاتے۔ اگر "کلچر" نامی کوئی شے ہے تو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک ہے۔ اس سے مراد انداز بود و ماند نہیں بلکہ وہ ذہنیت اور نفسیاتی نگاہ مراد ہے جو مستقل اقدار کی صداقت پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کا مظاہرہ اور ان اقدار کو بروئے کار لانے کے طریق الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن اس کا ان کے ملتِ واحدہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

لیکن ہمارے دانشوروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ غیر ملکی سیاحوں کو "پاکستانی کلچر" دکھانے کے لئے موہنجو ڈارو لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جو کلچر وہاں کے کھنڈرات میں مدفون ہے وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ نیز یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ علاقہ تقسیم ہند کے وقت حدودِ پاکستان میں شامل ہو گیا۔ اگر تقسیم کی لکیر ذرا ادھر کھینچ جاتی تو وہ ہندوستانی کلچر کا مظہر قرار پا جاتا۔ (طلوع اسلام اکتوبر، نومبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۹۲) (اقبال اور دو قومی نظریہ اپریل ۱۹۷۳ء)

ختمِ نبوت کا عقیدہ

طلوعِ اسلام نے اکتوبر نومبر ۷۴ء کی اشاعت میں لکھا (ص۹۴)

آئینِ پاکستان میں خدا خدا کر کے، ختم نبوت کے عقیدہ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا۔ اس سے میرزائی حضرات (جو اپنے آپ کو احمدی کہہ کر پکارتے ہیں) دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

۱۔ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیئے جا سکتے، نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے۔ نہ ہمارا آئین اسلامی۔ دو قومی نظریہ کا عملی مفہوم یہی ہے۔

۲۔ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے، نہ ملتِ واحدہ وجود میں آ سکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے۔

۳۔ جب تک دو قومی نظریہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا، پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا۔

۴۔ جب تک آپ قرآنی نظریۂ پاکستان کو اپنی تقریروں، تحریروں کا مرکزی، موضوع نہیں قرار دیتے، نہ اقبالؒ کی یاد میں اجتماعات منعقد کرنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے نہ قائدِ اعظمؒ کے یوم منانے سے کوئی فائدہ۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہوگا۔ اور قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پہ پاکستان حاصل کیا تو برصغیر میں نہ مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔[1] اور آپ مجھے اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں اس جگر شگاف اور جاں سوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجئے کہ اگر ہم نے نظریہ پاکستان اور اس کے عملی تضمنات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریہ حیات کا دوسرا نام ہے تو اول تو یہ مملکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجۂ جواز ہی ختم ہو جائے گی اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطۂ زمین تلاش کر لے گا۔ لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

کمیونزم سے بچاؤ

طلوعِ اسلام نے جون ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

جس مملکت میں قرآنی نظام رائج ہوا اسے کمیونزم سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اس سے تو خود کمیونزم خائف ہوگا۔ کہ اس کی موجودگی میں اس کا چراغ جل ہی نہ سکے گا یہ وجہ ہے جو ابلیس نے کہا تھا کہ: ؎

مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

ص۱ پرویز صاحب کے ایک خطاب کا اقتباس تھا۔

لیکن جس سرزمین میں پیشوائیت کا وضع کردہ مذہب رائج ہو، اس پر کمیونزم کے فکر کا مسلط ہونا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ آپ نگاہ دوڑا کر دیکھ لیجئے کہ کمیونزم انہی ممالک میں بار پاسکا ہے جن میں اسی قسم کا مذہب کارفرما تھا (خواہ وہ کوئی مذہب تھا) ہماری مذہبی پیشوائیت، کمیونزم کی مخالفت اس لئے نہیں کرتی کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہ اس کی مخالفت اس لئے کرتی ہے کہ اس میں ان کا وجود باقی نہیں رہتا، ورنہ جہاں تک اسلام کے خلاف ہونے کا تعلق ہے، مغرب کا نظامِ سرمایہ داری، یا جمہوری نظام ایسا ہی اسلام کے خلاف ہے جیسا کمیونزم کا نظام۔ یہ حضرات اس نظام (سرمایہ داری اور جمہوریت) کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ اسے عین مطابقِ اسلام بتاتے ہیں کیونکہ اس میں ان کا وجود باقی رہتا ہے۔

دین کے نظام میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہتا ہے نہ مغربی جمہوریت، نہ کمیونزم باقی رہتا ہے، نہ مذہبی پیشوائیت۔ اس میں فرعون کے ساتھ قارون اور ہامان بھی دریا برد ہو جاتے ہیں۔ اس میں باقی رہتا ہے صرف قرآن کا نظام: لا الٰہ الا اللہ سے یہی مراد ہے۔ کیپٹل ازم، سیکولرازم، کمیونزم، تھیاکریسی، سب طاغوتی الٰہ ہیں۔ قرآنی الٰہ کے سامنے ان میں سے کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ دوسری طرف، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی بھی الٰہ کی موجودگی میں، حقیقی الٰہ دروازے کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ جب تک کعبہ سے تمام بتوں کو نکال باہر نہیں کیا تھا، اس گھر کے مالک اور ربِ کعبہ نے اس میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم کمیونزم کے سیلابِ بے پناہ سے محفوظ رہیں تو اس کے لئے قدم اوّل یہ ہے کہ یہاں قرآنی نظام متمکن کیا جائے۔ لیکن اگر یہاں اس مذہب کی گرہیں بدستور مضبوط ہوتی ہیں جسے ہماری پیشوائیت اسلام کے نام سے پیش کرتی ہے تو پھر یہ کسی یلغار کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

شریعت بینچوں کی تشکیل

طلوعِ اسلام نے جنوری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شریعت بینچوں کی تشکیل کے سلسلہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

ہمارے نزدیک پچھلے ماہ (دسمبر) ہی کا نہیں بلکہ پچھلے سال ۱۹۷۸ء کا سب سے اہم واقعہ شریعت بینچوں کی تشکیل کے متعلق صدرِ مملکت کا اعلان ہے۔ شریعت بینچوں کی تشکیل کے فیصلے کو ملک میں عام طور پر سراہا گیا ہے۔ ان کے خلاف بنیادی طور پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اتنے قوانین کو ان کے دائرہ کار سے خارج قرار دے دیا گیا ہے کہ باقی قوانین بہت کم رہ جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ ہمارے پیشِ نظر مقصد کے لئے سردست اسے کچھ اہمیت نہیں کہ کتنے قوانین شریعت بینچوں کے دائرہ اختیار کے تابع رکھے گئے ہیں اور کتنے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ہماری بحث اصول سے ہے قوانین کی تعداد سے نہیں اور یہی وہ اصولی نکتہ ہے جس کی بنا پر ہم نے اس اعلان کو سالِ گذشتہ کا اہم ترین فیصلہ قرار دیا ہے۔

دین (الاسلام) کا منشا تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں متشکل کر دینا تھا۔ اس جامعیت کی بنیاد ضابطۂ ثبات و قوانین کی وحدت تھی جو خدا کی کتاب کے اندر محفوظ ہے۔ اس عالمگیر برادری کی تشکیل کے پروگرام کی ابتداء ایک اُمّت کی تشکیل سے کی گئی جسے اُمّتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ الدین (الاسلام) اور وحدتِ اُمّت لازم و ملزوم ہیں۔

صدرِ اوّل کے بعد یہ اُمّت مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور اس طرح الدین کی جگہ مذاہب نے لے لی۔ ہندوستان میں

مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ آزاد خطۂ زمین کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ اس میں پھر سے امت میں وحدت پیدا کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ وحدت قانون کی وحدت کے بغیر ممکن نہ تھی اور قانون کی وحدت کتاب اللہ کی بنیادوں پر قائم کی جا سکتی تھی۔ جسے تمام فرقے متفقہ طور پر ایمان کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے مذہبی فرقے اس کے لئے تیار نہ ہوئے کیونکہ امت کی وحدت سے فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے مطالبہ یہ پیش کیا کہ قانون کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھی جائے۔ بظاہر یہ مطالبہ بڑا معصوم اور مقدس تھا لیکن اس سے مقصد فرقوں کے وجود کو باقی رکھنا اور امت میں وحدت پیدا نہ ہونے دینا تھا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ (ضابطۂ قانون) ہے اور یہ فقہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان فقہوں میں ایک اختلاف شیعہ اور سنی کا ہے۔ پھر سنیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ (حنفی حضرات) کا، اگرچہ حنفیوں میں بھی دیوبندی اور بریلوی حضرات میں عقائد کے اعتبار سے سخت اختلاف ہے بہرحال یہاں کم از کم تین فقہیں تو مسلم ہیں۔ شیعہ حضرات کی فقہ۔ اہلِ حدیث کی فقہ اور حنفیوں کی فقہ۔ ان میں سے ہر فرقہ اپنی فقہ۔ اور اس فقہ کے ہر حکم کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سنت رسول اللہؐ کے مطابق ہے۔ ان میں باہمی اختلافات کے سلسلہ میں جو مباحثے یا مناظرے ہوئے ہیں ان میں ہر فرقہ اپنے ہاں کی سنت کو صحیح قرار دیتا ہے اور دوسروں کے ہاں کی سنت کو ناقابلِ اعتماد۔ ان فقہوں کا تعلق بیشتر پرسنل لاز (یعنی شخصی قوانین) سے ہے۔ اگر بزرگوں نے اپنے دورِ حکومت میں روش یہ اختیار کی کہ پرسنل لاز کی حد تک مسلمانوں کے ہر فرقے کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی اپنی فقہ پر عمل کرتے رہیں، پبلک لاز، حکومت نے اپنے احاطۂ اختیار میں رکھ لئے۔ ان قوانین کا اطلاق تمام لوگوں پر یکساں ہوتا تھا یہی صورتِ حال تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں بھی تھی۔ لیکن اگر اس مملکت کو اسلامی بنانا تھا تو پھر یہ صورتِ حال باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسلامی مملکت میں پرسنل لاز اور پبلک لاز الگ نہیں ہوتے۔ ایک ہی قانون ہوتا ہے جو ساری امت پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔ اس سے فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہ حضرات فرقوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے یہ دعویٰ اور مطالبہ کیا کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے اور پبلک لاز کتاب و سنت کی بنیادوں پر سب کے لئے مشترک بنایا جائے گا۔

طلوعِ اسلام نے کہا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی پبلک لاء بھی ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے مشترک اسلامی تسلیم کر لیں اور اس کی وجہ ظاہر تھی کہ سنت کے جس اختلاف کی بنیاد پر پرسنل لاء مشترک نہیں بن سکتا تھا، سنت کے اسی اختلاف کی بناء پر ایک مشترک پبلک لاء کیسے وجود میں آ سکتا تھا؟ چونکہ یہ حضرات نہیں چاہتے تھے کہ سنت کا یہ اختلاف ایک حقیقت بن کر قوم کے سامنے آ جائے۔ اس لئے انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ مشہور کر دیا جائے کہ طلوعِ اسلام منکرِ سنت ہے۔ مودودی صاحب نے بیس برس کے بعد اس کا اعتراف تو کر لیا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر فی الواقعہ پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر تسلیم کر لیں۔ لیکن مطالبہ ان کا بھی یہی رہا کہ پبلک لاز کا ضابطہ، کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ ان حضرات نے مطالبہ تو یہ جاری رکھا لیکن ایسا کوئی موقعہ پیدا نہ ہونے دیا جس سے یہ حقیقت قوم کے سامنے ابھر کر آ جائے کہ سنت کے متعلق ان حضرات کے باہمی اختلافات اس قدر گہرے اور شدید ہیں کہ اس کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قانون مرتب نہیں ہو سکتا جسے یہ حضرات متفقہ طور پر اسلامی

تسلیم کرلیں۔ شریعت بنچوں کی تشکیل سے متعلق مذکورہ بالا جیسے احکام اس قسم کا موقع بہم پہنچا دیں گے۔ یہ ہے وہ وجہ جس کی بناء پر ہم نے اس فیصلے کو اہم ترین قرار دیا ہے۔ یہ نکتہ ذیل کی مختصر مثالوں سے واضح ہو جائے گا

(پرسنل لاز کے شریعت بنچوں کے حیطۂ اختیار میں آنے کے بعد) ایک اہلِ حدیث حنفیوں کے قانونِ طلاق کو چیلنج کرسکے گا کہ وہ سنت کے مطابق نہیں۔ یہ چیلنج مناظرہ نہیں بلکہ ایک مقدمہ ہوگا جو عدالت میں زیرِ بحث آئے گا۔ شریعت بنچ اس کے متعلق فیصلہ دے گا اور وہ فیصلہ، ضروری مراحل طے کرنے کے بعد ملک کا قانون بن جائے گا جس کا اطلاق اہلِ حدیث اور حنفی حضرات دونوں پر یکساں ہوگا۔ یہ قانون جس فرقہ کے خلاف جائے گا اس کا اس باب میں ردِ عمل کیا ہوگا اس کی بابت ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ یہ معاملہ حکومت اور فرقہ کے مابین ہوگا۔ اسی قسم کی صورت ہر قانون کے بارے میں ہوگی۔ اور شیعہ، سنی، حنفی، اہلِ حدیث سب فرقوں کو متاثر کرے گی۔ اگر شریعت بنچوں کے اس قسم کے فیصلے برقرار رہے تو رفتہ رفتہ قانون کی وحدت پیدا ہو جائے گی اور فرقے باقی نہیں رہیں گے ——— یہ خواب تو بڑا حسین ہے۔ دیکھیں اس کی تعبیر کیا نکلتی ہے۔

شریعت بنچوں کے لئے فیصلے کا مدار قرآن و سنت سے مطابقت ہوگا۔ ابھی تک ہم نے سنت کے بارے میں اختلافات کا ذکر کیا ہے لیکن ایسے قوانین بھی تو ہوں گے جو سنت کے مطابق لیکن قرآن کے خلاف ہوں گے (جیسے قانونِ وصیت یا سنگسار کرنے کا قانون) ایسے قوانین کی صورت میں معلوم نہیں شریعت بنچ کیا فیصلہ دے گی اور کسطرح فیصلہ کریگی۔ اگر وہ سنت کے مطابق قانون مرتب کریں گے تو وہ قرآن کے خلاف جائے گا اور قرآن کے مطابق فیصلہ دیں گے تو وہ سنت کے خلاف ہوگا اور شرط ان پر یہ عائد کی گئی ہے کہ ان کا فیصلہ کتاب اور سنت دونوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر شریعت بنچوں سے متعلق احکام پر حکمیت سے عمل درآمد کیا گیا اور شریعت بنچوں نے عادلانہ دیانتداری کو ملحوظ رکھا (جس کی ہمیں پوری پوری توقع ہے) تو رفتہ رفتہ تمام قوانین کتاب اللہ کے مطابق مرتب ہوتے جائیں گے اور سنت کے صحیح اور غلط ہونے کے متعلق یہ معیار تسلیم کیا جائے گا کہ صحیح سنت رسول اللہ ہو سکتی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ فیصلہ ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ قرار پا سکتا ہے لیکن اس پر عملدرآمد کے لئے بڑی مومنانہ فراست اور قلندرانہ جرأت کی ضرورت ہوگی۔

یاد رکھئے! وحدتِ امت اور اس کے بعد وحدتِ انسانیت کا مدار وحدتِ قانون پر ہے اور قانونی وحدت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہو جو تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔

شرعی سزاؤں کا نفاذ

طلوعِ اسلام نے فروری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا

ملک میں اسلامی نظام کے احیاء کی خواہش بڑی مبارک و مسعود ہے لیکن خواہش کیسی ہی مبارک اور نیک کیوں نہ ہو اس کی صحیح نتیجہ خیزی کے لئے حسنِ تدبر لازم اور لاینفک ہے۔ کتنی ہی نیک خواہشیں اور مبارک ارادے ہیں جو عدمِ تدبر کی وجہ سے نہ صرف ناکام رہ جاتے ہیں بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی

جو منزّل من اللہ قرار دیا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ کتاب سے معنی قانون کے ہیں اور حکمت سے مراد وہ حسنِ تدبیر ہے جس کی رُو سے اس قانون کو نافذ کیا جاتا اور صحیح نتائج برآمد کرنے کا ضامن بنایا جاتا ہے۔ اس حسنِ تدبیر میں ترجیحات (PRIORITIES) یا تدریج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

معاشرہ کی اصلاح کا آغاز بچوں کی صحیح پرورش اور تربیت سے ہوتا ہے پھر ان کی تعلیم صحیح خطوط پر کی جاتی ہے۔ معاشرہ میں حالات ایسے پیدا کئے جاتے ہیں جن سے قانون کا احترام اور اتباع، افرادِ معاشرہ کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ قانون کے قیام و استحکام کے لئے ایسی انتظامیہ وجود میں لائی جاتی ہے جو ہر قسم کی لغزش سے منزّہ ہو۔ اس قسم کے اہتمامات اور انتظامات کے بعد اگر معاشرہ میں ایسے نفسیاتی مریض باقی رہ جائیں جن کے وجود سے معاشرہ کو نقصان کا اندیشہ ہو تو معاشرہ کی حفاظت اور خود انکی اصلاح کے لئے سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاشرتی اصلاح میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔

ہماری سوچ کا بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم مرض کے علاج کے لئے علّتِ مرض (مرض کے بنیادی سبب) کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے، علاماتِ مرض کی سطحی مرہم پٹی کو علاج سمجھ لیتے ہیں۔ اس نکتہ کو ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جن جرائم کی شرعی سزاؤں کے نفاذ کا پروگرام زیرِ تجویز ہے (یعنی چوری، زنا، شراب نوشی وغیرہ) مروّجہ قوانین کی رُو سے بھی وہ جرائم ہیں اور ان کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ اس کے باوجود یہ شکایت عام ہے کہ حقیقی مجرموں کو سزائیں نہیں ملتیں اور بے گناہ پکڑے اور مارے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے یہاں رشوت کا چلن عام ہے۔ اس باب میں پہلے تو پولیس ہی بدنام تھی اب عام عدالتوں کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اثباتِ جرم کے لئے جس طرح شہادات وضع کی جاتی ہیں اس کا بھی سب کو علم ہے۔

اب سوچیئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی ہی رہے اور سزائیں کر دی جائیں زیادہ سخت، تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف، اس سے خرابی اور بڑھ جائے گی بات واضح ہے اگر کسی جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظامِ عدل کی اصلاح کے بغیر سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی۔

اسلامی نظام کا آغاز سزاؤں سے کرنے کا ایک نقصان تو وہ ہوگا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی اس سے رشوتوں کے دروازے وسیع ہو جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان ایک اور ہوگا۔ ہم نے صدیوں کے بعد اسلامی نظام کے احیاء کا دعویٰ اور اس کے انسانیت ساز نتائج کا فردوس بداماں منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں، اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہماری طرف لگ رہی ہیں۔ اگر زیرِ نظر تجربہ ناکام رہا تو دنیا ہمارے متعلق جو کچھ بھی سوچے گی سو سوچے گی وہ اسلام کے متعلق اپنے اس خیال میں پختہ ہو جائے گی کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور ان کے اس پروپیگنڈے سے خود ہمارے ہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو کر اسلام کی طرف سے بددل ہو جائے گا اور اس کی یہ بددلی خود پاکستان کے مستقبل کو بری طرح مجروح کر دیگی۔ یہ ایسا نقصان ہوگا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

باب المراسلات

سوال:۔ اسلامی نظامِ حکومت کے متعلق آج کل بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ اس میں سربراہِ مملکت کے طریق انتخاب کے مسئلہ نے خاص طور پر اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ اسلامی نظام کے مدعیوں کا تقاضا ہے کہ اس کے لئے ہمیں اسلام کے صدرِ اول (عہدِ صحابہ کبارؓ) کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور جو طریق وہاں سے ملے اسے اختیار کر لینا چاہیئے کیونکہ وہی طریق اسلامی کہلا سکتا ہے۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ اس زمانے میں طریقِ انتخاب کیا تھا؟ بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب (جو تاریخِ اسلام کا سب سے پہلا انتخاب تھا) کس طرح عمل میں آیا تھا؟

جواب:۔ اس زمانے میں طریقِ انتخاب کیا تھا اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا تھا اس کے متعلق نہ ہم ذاتی طور پر کچھ جانتے ہیں نہ آج دنیا کا کوئی اور انسان۔ اس کے لئے لامحالہ ہمیں اس دور کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ان معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ معلومات کتبِ تاریخ میں بھی ملتی ہیں اور کتبِ روایات میں بھی۔ تاریخِ طبری سب سے پہلی مفصّل تاریخ ہے اور اسے مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ کتبِ روایات میں امام بخاریؒ کا مجموعہ، کتاب اللہ کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب مانی جاتی ہے، اور (اہلِ حدیث کے عقیدہ کی رُو سے) اس کی کسی ایک روایت کا انکار بھی مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ صدرِ اول کے سب سے پہلے انتخاب (یعنی انتخابِ حضرت صدیقِ اکبرؓ) کے متعلق ان میں کیا لکھا ملتا ہے[1]

تاریخ بتاتی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، جب کہ ہنوز آپؐ کی تکفین و تدفین بھی عمل میں نہیں آئی تھی، سقیفہ بنی ساعدہ (مدینہ) میں انصارؓ کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ (انصاری) کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ اس کے بعد صحابہؓ، مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر مہاجرین صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ پہلے "فریقین" کے نمائندوں نے تقریریں کیں جن میں ہر ایک نے اپنی اپنی "پارٹی" کے امیدوار کے استحقاقِ خلافت پر زور دیا (بعینہٖ جس طرح آج کل الیکشن پراپیگنڈہ میں ہوتا ہے)۔ چنانچہ انصار میں سے حضرت حباب بن منذرؓ نے اپنی تقریر میں کہا:۔

اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں میں رکھو، کیونکہ لوگ تمہارے مطیع ہیں۔ کسی شخص میں جرأت

---

[1] واضح رہے کہ ہم نہ اس تاریخ کو بالکلیہ صحیح مانتے ہیں، اور نہ ہی روایات کے مجموعوں کو صحائفِ خداوندی جن کے انکار سے ایک مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان میں صحیح روایات بھی ہیں اور ضعیف بھی۔ ہم یہاں صرف یہ بتا رہے ہیں کہ ان میں اس باب میں کیا لکھا ملتا ہے۔

نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہل عزت و ثروت ہو، تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو، تم بہادر اور دلیر ہو، لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔"

(محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکرؓ صدیق اکبر" صفحہ ۱۰۱ ۱)

یہ تو ہوا انصار کے متعلق۔ اب مہاجرین کی بابت سنیئے (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

حضرت عمرؓ کی تقریر

ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں! اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائلِ ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیرو، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔　　　　(ابوبکر صدیقؓ، از ہیکل - صفحہ ۱۰۱)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا:۔

اے انصار!۔۔ تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو! اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصّہ غصب کر لیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہیں اس کے سب سے زیادہ حقدار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو۔ اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔　　　　(ایضاً صفحہ ۱۰۸-۱۰۹)

حضرت عمرؓ نے یہ تقریر سنا تو کہا:۔

اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔　　　　(ایضاً صفحہ ۱۰۹)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا:

ہمیں نہیں اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔　　　　(ایضاً صفحہ ۱۰۹)

---

۱ یہ تمام واقعات طبری کی تاریخ میں مذکور ہیں۔

تقاریر کے بعد "عمل" کی باری آئی۔ اس میں کیا ہوا؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سنیئے۔ تاریخ طبری میں ہے :-

دست وگریباں

اب ہر طرف سے لوگ ..... آ آکر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آکر بیعت کرو۔ سعدؓ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم، اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں۔ تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری۔ جلد اوّل۔ حصّہ چہارم۔ اردو ترجمہ۔ شائع کردہ۔ جامعہ عثمانیہ۔ صـــ)

اس سے ایک صفحہ آگے ہے :-

معاذ اللہ

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ببر ہوں اور شیر کی کچھار میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی، عمرؓ نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آکر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دور رہے، جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ دوڑے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے۔ وہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

سلیم مقام کر اس فقرہ کو پھر پڑھیئے :-

اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی (استغفراللہ)

بہر حال حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد، دوسرے امیدوار، حضرت سعدؓ کا کیا طرزِ عمل رہا؟ سنئے! اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔ (طبری ص۳)

حضرت علیؓ نے جو اس "انتخابی مہم" میں شریک نہ تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت نہ کی۔

حضرت صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقاءؓ حضرت علیؓ کے ہاں گئے اور انہیں بیعت کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ بڑے جوش و خروش سے تقریریں ہوئیں۔ بالآخر:-

حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے: "اللہ اللہ اے گروہ مہاجرین! تم رسول اللہؐ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہلِ بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہم خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں کیونکہ ہم اہلِ بیت ہیں ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہہ، رسول اللہؐ کی سنت کا عالم، رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے، اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔" راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں تو کہا: "اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

"اے بنتِ رسول اللہؐ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ غصہ میں آ کر جواب دیتے: "کیا میں رسول اللہؐ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟"

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں: "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔" (ہیکل۔ ابوبکرؓ صفحہ ۱۲۲-۲۵)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت آئی ہے:-

بخاری کی حدیث

حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لایئے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا تم کیا سمجھتے ہو وہ میرا کیا کر لیں گے، خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔ "ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پہ جو حق تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امرِ خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حق ہے [۳]

(بخاری۔ کتاب المغازی)

یہ ہے جو کچھ "اسلام میں سب سے پہلی انتخابی مہم" کے متعلق کتبِ تاریخ اور کتبِ احادیث سے ثابت ہے۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اسلامی نظام کی ہیئتِ کذائی کے لئے صدرِ اوّل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تو ان سے کہیئے کہ اگر ان کے پاس اس انتخاب کی کوئی اور روئداد ہے تو اسے پیش کریں۔ اور اگر ایسا نہیں (اور یقیناً نہیں)۔

تو پھر انہیں چاہیئے کہ وہ (معاذ اللہ) اس سنتِ صحابہؓ کی پیروی کریں (اور ان سے ... یہ پوچھئے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری ساری تاریخ میں یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس امت (بلکہ اسلام) کے خلاف ایک ایسی مہیب سازش ہوئی ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

---

[۱] بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبریؒ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ کیا ہے "معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو انہوں نے جواب دیا کہ نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔

(ابن جریر طبریؒ۔ جلد اوّل۔ حصہ سوم۔ اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۵۹۲)

[۲] ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقعہ پہ تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا (ایضاً)

[۳] ابن جریر طبریؒ نے اپنے ہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقاً فاستبددتم به علینا۔ یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ایضاً)

مسلمانوں کو جس قدر عقیدت و ارادت ذاتِ رسالتمآب اور صحابہ کبارؓ سے ہو سکتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سازش کرنے والوں نے ان کے اُن مقدس جذبات کا استحصال (EXPLOIT) کیا۔ ان سے کہا کہ اسلام نام ہے سنتِ رسول اللہؐ اور سنتِ خلفائے راشدینؓ کے اتباع کا۔ ادھر یہ کہا، اور ادھر اس قسم کی وضعی روایات اور افسانوی حکایات، حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کر دیں جن سے اسلام جڑ بنیاد سے کٹ جائے۔ ان روایات اور حکایات کا نام رکھ دیا، سنتِ رسول اللہ اور سنتِ صحابہ کبارؓ۔ اس تاریخ کا نمونہ سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ کیا آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی تصور کر سکتے ہیں کہ صحابہ کبارؓ کا (معاذ اللہ) کردار فی الواقعہ ایسا تھا جیسا سقیفہ بنی ساعدہ کی روئداد میں سامنے آیا ہے؟ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، یہ روئداد مبنی ہے "تاریخ طبری" پر جو ہماری سب سے پہلی مفصل تاریخ ہے، اور مجموعۂ احادیث امام بخاریؒ پر۔ ۔ ۔ جسے سب سے زیادہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ وضعی روایات اور افسانوی حکایات ان کتابوں میں داخل ہو گئیں اور پھر ایسا اہتمام کیا کہ عہدِ رسالتمآب اور دورِ خلافتِ راشدہ کے کوائف سے متعلق کاغذ کا کوئی پرزہ تک بھی کہیں سے نہ مل سکے۔ اس طرح امّت کو مجبور کر دیا کہ وہ اسی کو سنتِ رسول اللہ اور دورِ خلافتِ راشدہ کی تاریخ سمجھے جو ان کتابوں میں مذکور ہے۔

اس مقام پر یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ سازش کرنے والوں نے تو کچھ کرنا۔ ۔ ۔ ہی دیا تھا، ہمارے علماء اور دانشوروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ انہی روایات اور حکایات کو (جو بالبداہت وضعی نظر آ جاتی ہیں) سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ اس کی وجہ یا دنی تدبر سمجھ میں آ سکتی ہے۔ تاریخ کی سب سے پہلی مفصل کتاب (طبری) تیرہ جلدوں میں ہے۔ اس کے بعد تاریخ کی جس قدر کتابیں مرتب ہوئیں وہ اصلاً اسی پر مبنی ہیں۔ حدیثوں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ ان کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ اس قدر کثیر ذخیرہ میں ہر شخص کو اس کی منشا کے مطابق مسا دل جاتا ہے مثلاً مولانا مودودیؒ مرحوم نے جب کہا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے تو اس کی سند میں انہوں نے احادیث پیش کی تھیں جب انہوں نے کہا کہ ایک داعیٔ اقامتِ دین کے لئے جائز ہے کہ اپنی دعوت کے آغاز میں نہایت بلند آہنگ اصول پیش کرے، لیکن جب حصولِ اقتدار کا وقت آئے تو ان تمام اصولوں کو اٹھا کر پھینک دے تو اس کی تائید میں بھی انہوں نے سنتِ رسول اللہ کو پیش کر دیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ اپنے مخالف کو کذب بیانی اور فریب دہی سے قتل کر دینا چاہیئے تو اس کی سند میں بھی وہ احادیث ہی لائے تھے (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے سربراہ میاں طفیل محمد صاحب کو جب ضرورت پیش آئی کہ پارٹی بازی کو مطابقِ اسلام ثابت کیا جائے، تو اس کی تائید میں انہوں نے بھی یہی فرمایا تھا کہ "صحابہؓ نے اپنی اپنی جماعتیں بنائی تھیں"۔ (روزنامہ جنگ لاہور، ۲۸ اگست ۱۹۸۲ء)

انہیں یہ سب کچھ انہی ذخیروں سے ملا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں جس نے جو کچھ خلاف اسلام کہا یا کیا ہے، تاریخ یا روایات کے حوالوں ہی سے کیا ہے۔ آج بھی جو کچھ اسلام کے نام سے ایک دوسرے کے خلاف کیا جاتا ہے۔ اس کی تائید میں اسی تاریخ اور روایات کو پیش کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان وضعی روایات اور حکایات کو محفوظ کیوں رکھا جا رہا ہے؟ محفوظ ہی نہیں رکھا جا رہا بلکہ جو شخص یہ کہہ دے کہ یہ روایات اور حکایات صحیح نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان سے حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہو جاتی ہے، تو اسے منکرِ سنت قرار دے کر اس پر کفر کے فتوے عائد کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ کچھ دین کی حفاظت کے لئے نہیں کیا جاتا۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کیا جاتا ہے۔ ان ذخیروں کا تقدس برقرار رہے تو ان کے لئے نت نیا اسلام وضع کرنے کی گنجائش کہاں رہے؟ یہ حضرات قرآن کی طرف اسی لئے نہیں آتے کہ اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

آپ ذرا اس پر غور کریں کہ جو کچھ سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آیا ہے، وہ صحابہؓ کی شانِ اقدس میں کس قدر سوء ادبی پر مشتمل ہے۔ ان حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صحابہؓ کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی زبان پر لے آئے تو یہ اس کے خلاف قیامت برپا کر دیتے ہیں (اور ایسا ہونا بھی چاہیئے) لیکن اس لٹریچر کو سر پہ اٹھائے پھرتے ہیں جو صحابہؓ کی اس قسم کی تصویر پیش کرتا ہے!

اس پر شاید آپ کہیں کہ اگر ہمارا یہ لٹریچر ایسا ہی ہے تو پھر حضور نبی اکرمؐ کی پاکیزہ سیرت اور صحابہؓ کی قابلِ تسلیم تاریخ کس طرح مرتب کی جائے؟ اس کا جواب آسان ہے۔ حضورؐ خدا کے رسول تھے۔ صحابہ کبارؓ کو خود خدا نے مومنِ حقّا قرار دیا ہے اور ان کے لئے جنت کی بشارت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ اور ان صحابہؓ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن ہمارے پاس محفوظ شکل میں موجود ہے۔ کتبِ تاریخ اور روایات میں جو کچھ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے متعلق آیا ہے اسے قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے جو اس کے خلاف ہو اسے بلا تامل مسترد کر دیا جائے۔ طلوعِ اسلام نے شروع سے یہی انداز اختیار کر رکھا ہے۔ اسی کے مطابق پرویز صاحب نے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ (معراجِ انسانیت) مرتب کی ہے۔ اور اسی کے مطابق دورِ فاروقی کی تاریخ (شاہکارِ رسالت) ان پر کسی جگہ بھی انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں۔

اب رہا آپ کا اصل سوال کہ اسلامی نظام کی ہیئت کی تشکیل کس طرح کی جائے اور اس کی جزئیات کس طرح مرتب کی جائیں۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ (ان جزئیات کے سوا جو خود قرآن میں مذکور ہیں) اللہ تعالیٰ نے دین (یا اسلامی نظام) کے اصول عطا فرمائے ہیں، اور اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ان کی جزئیات باہمی مشورہ سے، خود مرتب کرے۔ قرآنی اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی (اسطرح مرتب کردہ) جزئیات قابلِ تغیر و تبدل ہونگی۔ اس سے واضح ہے کہ کسی دور کی مرتب کردہ جزئیات آنے والی امت کے لئے ناقابلِ تغیر دین کا درجہ نہیں رکھیں گی۔ اگر دین کا منشا یہ ہوتا کہ عہدِ رسالتمآب اور خلافت کی طے کردہ جزئیات ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر رہیں تو حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے لئے لازم تھا کہ انہیں بھی قرآن کی طرح محفوظ شکل میں امت کو دے جاتے۔ صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے عمداً ایسا نہیں کیا اور اب ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یقینی اور حتمی طور پر متعین کیا جا سکے کہ اس دور کی یہ جزئیات کیسی تھیں۔ اس کے لئے جو ممکن ذرائع ہیں (یعنی تاریخ اور روایات) ان کی ایک جھلک سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ یہ تو صرف ایک جھلک ہے۔ اگر کہیں یہ تفاصیل بالکلیہ آپ کے سامنے آجائیں تو آپ بلبلا اٹھیں!

لہذا یہ کہنا کہ اسلامی نظامِ حکومت کی جزئیات کے لئے ہمیں صدرِ اوّل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، ایک مقدس اور نازک جذبہ تو قرار دیا جا سکتا ہے (بشرطیکہ ایسا کہنا خلوص پر مبنی ہو) لیکن یہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ یاد رکھئے! جب تک امت جذبات کے اس گرداب سے نہیں نکل جاتی، اسلامی نظام کے متشکل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

لیکن مذہبی پیشوائیت امت کو اس گرداب سے نکلنے نہیں دے گی، کیونکہ اس سے ان کے تمام مفادات ہی دریا برد نہیں ہو جاتے، خود ان کی ہستی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اسے سن رکھئے کہ جب بھی کوئی قوم اسلام کے احیاء کے لئے اٹھے گی اس کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ ——— اسلام یا یہ لٹریچر؟ اسلام کا احیاء وہی قوم کر سکے گی جو جرأتِ فاروقی سے کام لے کر یہ کہہ سکے کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

دوسرا سوال

یہ پوچھا گیا ہے کہ صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم کے اختیارات کی جو بحث چل رہی ہے اس میں قرآن کا جواب کیا ہے؟

قرآن کا جواب یہ ہے کہ صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم تو ایک طرف، پارلیمان (بلکہ ساری امت) کو بھی کوئی اختیار بلا مشروط حاصل نہیں۔ ان سب کے اختیار اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کا کوئی فیصلہ یا عمل، قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اس باب میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ،

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

(ضمناً) اس سے پہلے یہ آیت، سیاسی پلیٹ فارم تو ایک طرف، محراب و منبر سے بھی سننے میں نہیں آتی تھی لیکن مقامِ تشکر ہے کہ پچھلے دنوں (کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے) صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق صاحب نے صرف اس آیت ہی کو نہیں، اس سے ملحقہ دو آیات کے یہ الفاظ بھی دہرائے کہ "یہی لوگ ظالم ہیں" (۵/۴۵) "یہی لوگ فاسق ہیں"۔ (۵/۴۷) اگر صدرِ مملکت، اس قرآنی اصولِ محکم کو اپنے مجوزہ دستور کی بنیاد قرار دے لیں، تو تمام اختلافات ختم ہو جائیں لیکن اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔ وہ قرآنِ خالص کو آئین و قوانین کی بنیاد قرار پانے ہی نہیں دیں گے۔ وہ حدیث (سنت) اور فقہ کو اس کے ساتھ ضرور منسلک کریں گے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں ان کے ساتھ بڑی عقیدت ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم سابقہ سوال کے جواب میں دیکھ چکے ہیں) اس سے ان کے لئے حسبِ منشاء اسلام وضع کرنے کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ (مثلاً) اسی سوال کو لیجئے کہ صدرِ مملکت، پارلیمان (مجلسِ مشاورت) کے فیصلوں کا پابند ہوگا یا اسے ان کے مسترد کر دینے کا اختیار ہوگا (مولانا) مودودی (مرحوم) نے (اپنی امارت کے سلسلہ میں) فرمایا تھا۔

> جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً اس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی صفحہ ۴۳-۴۴)

یعنی صدارتی نظام اسلام کے مطابق ہے۔ ان سے کہا جاتا تو اس کے حق میں کئی ایک احادیث پیش کر دیتے۔

اس کے بعد جب یہی سوال صدر ایوب (مرحوم) کے سلسلہ میں سامنے آیا تو انہوں نے فرمایا جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے لیا جائے یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اسے تسلیم کیا جائے کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے"۔ بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورہ سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ دے دینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

یعنی (صدارتی نظام نہیں) پارلیمانی نظام مطابقِ اسلام ہے (مولانا) مودودی (مرحوم) کے پاس اس کی تائید میں بھی احادیث ہوں گی۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات قرآن کے ساتھ "سنت" کو کیوں لاحق کرتے ہیں۔ اس سے موافق، مخالف ہر قسم کے مسلک کی تائید مل جاتی ہے۔ اگر صرف کتاب اللہ کو بنیاد قرار دیا جائے تو اس سے متضاد یا متخالف مسالک کی تائید نہیں مل سکتی کیونکہ (اس کے ارشاد کے مطابق) اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

صدارتی نظام کی تائید میں قائداعظم کی کسی پرائیویٹ ڈائری کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ ہمیں اس ڈائری کا علم نہیں۔ نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہے۔ اس لئے کہ قائداعظمؒ نے پبلک میں اتنا کچھ کہا تھا کہ اس کی موجودگی میں ان کی کسی پرائیویٹ ڈائری کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ ان کے بے شمار پبلک بیانات میں سے، صرف وہ بیان لیا جائے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) میں دیا تھا تو وہ اس سوال کے فیصلہ کن جواب کی حیثیت رکھے گا۔ انہوں نے جو کچھ (قرآن کی روشنی میں کہا اس نے) اختیارات کی بحث کو ختم کر دیا۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (بحوالہ اورینٹ پریس اوف انڈیا)

اختیارات کو قرآنی حدود میں محصور کر دیجئے پھر چاہے پورے کے پورے اختیارات صدر کو دے دیجئے چاہے وزیراعظم کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ وہ صاحبِ اختیار ہو گئے ہی نہیں۔

لیکن مسندِ اقتدار پر سرفراز ہو جانے کے بعد اپنے اوپر اتنی پابندیاں عائد کرنے کے لئے بڑے مومنانہ کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی جوہر سے صحیح اختیار پیدا ہوتا ہے۔

ہماری دشواری یہ ہے کہ ہم نام اسلام کا لیتے ہیں اور سوچتے، کرتے سب سیکولر انداز سے ہیں۔ آپ نے دیکھا

ہے کہ آج کل ہمارے ہاں ”تکمیلِ جمہوریت اور تدوینِ دستور“ کی جو بحثیں چل رہی ہیں، ان کا انداز بعینہٖ مغربی اقوام کی بحثوں کا سا ہے۔

تیسرا سوال

آج کل یہ بحث بھی چل رہی ہے کہ صدرِ مملکت کو پارلیمان کے فیصلوں پر ویٹو کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں۔ ویٹو کے اختیار کی تائید میں قرآنِ مجید کی وہ آیت پیش کی جاتی ہے جس میں نبی کریمؐ سے کہا گیا ہے کہ امت کے ساتھ مشورہ کیا کرو۔ اور جب کسی بات کا فیصلہ کر لو تو پھر خدا پر بھروسہ کر کے اس فیصلہ پر عمل کیا کرو۔ کیا قرآن مجید سے یہ استدلال صحیح ہے۔

جواب:- صدرِ مملکت کو ویٹو کا حق حاصل ہوگا یا نہیں، اس کے متعلق، مودودی صاحب (مرحوم) کے جو دو اقتباسات سابقہ سوال کے جواب میں نقل کئے گئے ہیں۔ ان سے واضح ہے کہ (مرحوم کے تصور کے اسلام کی رُو سے) امیرِ مملکت کو (۱) یہ حق حاصل ہو سکتا ہے۔ اور (۲) نہیں ہو سکتا یعنی ”اسلام“ کی رُو سے فیصلہ کرنے کے لئے دیکھنا یہ ہوگا کہ امیرِ مملکت ہے کون؟ اگر مودودی (مرحوم) یا ان کے کوئی ہمنوا ہیں تو اسے یہ حق حاصل ہوگا۔ اگر ان کے فریقِ مخالف کا کوئی شخص (صدر ایوب مرحوم) ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس پر اس سوال کو ختم ہو جانا چاہیئے لیکن چونکہ مستفسر نے بات قرآنی آیت کے حوالے سے دریافت کی ہے، اس لئے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

مذکورہ بالا آیت یہ ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۹)

(خطاب چونکہ رسول اللہؐ ہیں اس لئے حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ امورِ مملکت میں اپنے رفقا کے ساتھ مشورہ کیا کرو اور جب تو عزم کر لے تو پھر خدا پر بھروسہ کر کے (اس فیصلہ پر عمل پیرا ہو جاؤ)

اس آیت میں بحث ساری عَزَمْتَ کے نکتہ کے گرد گھومتی ہے۔ عَزَمْتَ صیغہ واحد حاضر ہے جس کے معنی ہیں۔ جب تو عزم کرے..... ویٹو کے مؤید اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس میں آپؐ کو رفقاء کے مشورہ کا پابند نہیں کیا گیا۔ آخری فیصلہ حضورؐ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ آپ چاہیں تو مشورہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور چاہیں اس مشورہ کو مسترد کر کے، اس کے خلاف اپنا فیصلہ صادر فرمائیں۔ فریقِ مخالف کا یہ کہنا ہے کہ آیت میں حضورؐ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس سے انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ فیصلہ مشورہ کے مطابق کیا جائے گا۔ ایسا نہ ہو تو مشاورت بے معنی ہو جاتی ہے اگر منشا یہ ہوتا کہ آپ مشورہ مسترد کر کے اپنا فیصلہ صادر فرمائیں تو آیت میں ایسا کہنا چاہیئے تھا چونکہ ایسا نہیں کہا گیا اس لئے مشاورت کے حکم کا منشا یہی تھا کہ فیصلہ مشورہ کے مطابق کیا جائے۔ باقی رہا یہ سوال کہ عَزَمْتَ میں صیغہ واحد متکلم کا ہے، تو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ خواہ ہزار افراد سے کیا جائے، فیصلہ تو بہرحال، ایک فرد (منعقدہ اتفاق فی امیرِ مملکت) ہی کو کرنا ہوگا۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ عَزَمْتَ میں چونکہ فیصلہ رسول اللہؐ پر چھوڑا گیا ہے، اس لئے یہ واضح ہے کہ آپ مشاورت کے فیصلے کے پابند نہیں تھے اور اس کے بعد دونوں فریق

ملہ ہم سردست اپنی رائے پیش نہیں کر رہے، صرف فریقین کے خیالات پیش کر رہے ہیں۔

تاریخ اور روایات کی طرف جاتے ہیں (جہاں سے (حسب معمول) دونوں کو ان کی تائید میں سندات مل جاتی ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ لکھا ہے :-

> آیت میں فرمان ہے کہ کاموں کا مشورہ ان سے لیا کر۔ اسی لئے حضورؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ۔ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) تو آپ اس حکم خداوندی کی تعمیل میں لوگوں سے مشورہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ محض ان کو خوش کرنے کے لئے ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ (معاذ اللہ)۔ اس کے بعد ابن کثیر نے متعدد واقعات نقل کئے ہیں جن میں حضورؐ نے اپنی رائے کے خلاف (مشورہ) پر عمل کیا۔ ابن کثیر نے آگے چل کر کہا ہے کہ،

> حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے مشورہ کرنے کا حکم ہے .... مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہؐ نے ان دونوں بزرگوں سے فرمایا کہ اگر تمہاری دونوں کی کسی امر میں ایک رائے ہو جائے تو میں تمہارے خلاف کبھی نہ کروں گا۔

یعنی (روایات کی رو سے) : شَاوِرْهُمْ میں هُمْ ــــ ضمیر جمع غائب ... سے مراد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تھے۔ اور حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس بات پر ان دونوں کا اتفاق ہو جائے۔ میں اس کے خلاف کبھی نہیں کروں گا۔

> امت سے مشاورت کی ایک تعبیر یہ بھی ہوئی!

آگے چل کر لکھا ہے :-

> حضورؐ سے سوال ہوتا ہے کہ عزم کے کیا معنی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ جب عقل مند لوگوں سے مشورہ ہو جائے، پھر ان کی مان لینا۔ (ابن مردویہ)

(تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی مرحوم۔ پارہ چہارم ص ۳۴-۳۶)

(مولانا) مودودی (مرحوم) نے ایک مرتبہ لکھا کہ نبی اکرمؐ آغاز نبوت کی پہلی سانس سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک [1] نبی تھے اور حضورؐ کا ہر قول اور فعل وحی کی رو سے ہوتا تھا۔ اس پر ان پر اعتراض کیا گیا کہ اگر صورت یہ تھی تو پھر آپ کو دوسروں سے مشورہ لینے کا حکم کیوں دیا گیا؟ اس کے جواب میں مرحوم نے لکھا :

> لیکن رسول اللہؐ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو مشورہ کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔ (تفہیمات۔ حصہ اول۔ ص ۲۴۴-۲۴۵)

مودودی صاحب (مرحوم) نے (حسب معمول) بات کو مبہم رکھا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ وہ صحیح طرز حکومت کیا تھی جس کی بنیاد حضورؐ نے رکھی تھی؟ کیا اس میں مشاورتی فیصلہ کی پابندی لازم تھی یا فیصلہ سربراہ مملکت کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا؟ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات اور کہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ صدر اول میں انداز حکومت موجودہ دور کا سا نہ

[1] انہوں نے بعد میں اپنے اس موقف کی شدت سے تردید کی تھی۔ دیکھئے "رسائل و مسائل" حصہ اول۔ بحث سنت۔

اُس میں نہ کوئی (دورِ حاضرہ کے انداز کی) پارلیمان تھی۔ نہ وزیرِ اعلیٰ اور صدرِ مملکت کے مناصب الگ الگ تھے۔ صرف ایک سربراہِ مملکت ہوتا تھا۔ اس لئے عَزَمۡتَ سے مراد وہی سربراہِ مملکت تھا۔ اب وزیرِ اعظم اور ہوتا ہے اور صدرِ مملکت اور۔ اگر آئین کی رو سے، فیصلوں کا اختیار وزیرِ اعظم کو دے دیا جائے تو عَزَمۡتَ سے مراد وہی (وزیرِ اعظم) ہو جائے گا خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ عَزَمۡتَ سے مراد صدرِ مملکت ہے۔ وزیرِ اعظم نہیں۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ حضرات اپنے دعویٰ کی تائید میں صرف وہ آیت پیش کرتے ہیں جس میں خطاب نبی اکرمؐ سے ہے۔ حضورؐ کو حقِ استرداد (ویٹو) حاصل تھا یا نہیں، اس بحث کا تعلق ہم سے ہے ہی نہیں۔ خدا نے اُمت کے لئے جو راہ نمائی دی ہے ہم پر اسی کا اطلاق ہوتا ہے اور وہ راہ نمائی یہ ہے کہ:

وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (۴۲:۳۸)

ان کے امور ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہی نہیں کہ فیصلہ (عزم) کون کرے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ مشاورت سے طے ہو گا وہی فیصلہ ہو گا۔

۱۔ آپ نے غور فرمایا کہ (اوّل تو یہ حضرات قرآن کی طرف آتے ہی نہیں لیکن) اگر کبھی اس کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو یہ کسطرح ہر ایک، قرآن سے کھینچ تان کر اپنی تائید میں سند لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول اقبالؒ

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم (مخالف) سے کہا تھا کہ وَاتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِيًّا (۱۱/۹۲)۔ تم نے خدا کو بطور "ظِهۡرِيًّا" رکھ چھوڑا ہے۔ عربوں کے ہاں معمول تھا کہ وہ جب سفر کے لئے نکلتے تو جتنے اونٹوں کی ضرورت ہوتی ان سے دو ایک زائد ساتھ رکھ لیتے کہ عند الضرورت کام آئیں۔ ان فالتو اونٹوں کو "ظھری" کہتے تھے۔ آجکل کی اصطلاح میں انہیں (EXTRAS) کہہ سکتے ہیں۔

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم اہمیت تو اور چیزوں کو دیتے ہو لیکن جب تمہارے دیگر حربے ناکام رہ جاتے ہیں تو تم خدا کو سامنے لے آتے ہو جسے تم نے بوقتِ ضرورت کام آنے کے لئے بطور (EXTRA) رکھ چھوڑا ہے۔ اس قوم کا تو معلوم نہیں لیکن ہم نے قرآن کو جسطرح بطور "ظِهۡرِيًّا" رکھ چھوڑا ہے واضح ہے۔ جب کسی کے پاس کوئی اور دلیل باقی نہیں رہتی تو وہ قرآن کو بطور رہبر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے قرآن کریم نے بہ نصِ صریح بتا دیا ہے کہ جو کچھ کتاب اللہ کے مطابق ہے وہ اسلام ہے جو اس کے مطابق نہیں وہ کفر ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس نے نظامِ زندگی کے لئے بیشتر اصول دیئے ہیں اور اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی عملی جزئیات خود متعین کر لے۔

اس نے اصول یہ دیا ہے کہ امورِ مملکت امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس مشاورت کا

طریق کیا ہوگا، فیصلہ کس طرح کیا جائے گا اور اس پر عمل درآمد کون کرائے گا۔ اسے اس نے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن ان جزئیات کے طے کرنے میں قرآن کی بنیادی شرط اٹل اور غیر متبدل رہے گی یعنی یہ کہ ہر فیصلہ قرآن کے مطابق ہو۔ اس قسم کی مشاورت کی ایک مثال ہمیں حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ملتی ہے، اور چونکہ وہ قرآن کے مطابق ہے اس لئے ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ عراق فتح ہوا تو اس کی وسیع و عریض زرعی اراضی مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ مسئلہ زیرِ مشاورت یہ تھا کہ ان اراضیات کا کیا کیا جائے۔ عام صحابہؓ کی رائے تھی کہ انہیں (مالِ غنیمت کی طرح) سپاہیوں (مجاہدین) میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تاریخ نے اس مشاورت کی طویل و عریض روئداد اپنے دامن میں محفوظ کر رکھی ہے۔ اس مجلس کی مختلف نشستیں منعقد ہوئیں اور ہر نشست میں، مخالفت اور موافقت، نہایت پرجوش تقاریر ہوئیں۔ لیکن بحث فیصلہ کن مرحلہ پر نہ پہنچ پائی۔ حضرت عمرؓ نے بعض ماہرین اراضیات کو بھی شاملِ بحث کر لیا اور اس مجمع سے فرمایا۔

> میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری موافقت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کسی نے میری مخالفت کی ہے نہ اس پر فخر کہ کسی نے میری موافقت کی ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں صرف آپ کی توجہ اس بات کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ... ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔

اس کے بعد اجلاس تین دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا کہ قرآن مجید پر مزید غور و خوض کیا جا سکے۔ تین دن کے بعد پھر اجلاس منعقد ہوا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ الحمد للہ مجھے قرآن مجید سے بین راہ نمائی مل گئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قرآنی آیات پیش کیں جن سے واضح تھا کہ (جیسا کہ حضرت عمرؓ نے تجویز کیا تھا) اراضیات مملکت کی تحویل میں رہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ۔

> قرآنی استدلال کو سن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور مخالفین اور موافقین سب جوشِ مسرت سے بیک زبان پکار اُٹھے کہ آپ کی رائے درست ہے۔ ہم سب اس سے متفق ہیں۔ (شاہکارِ رسالت)

یہ تھا طریقِ مشاورت اس دور میں جب ہر فیصلہ کا معیار کتاب اللہ کو قرار دیا جاتا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں کوئی ایسے نکات نہیں اٹھائے گئے جنہیں حل کرنے کے لئے ہم آج سر کھپاتے (بھی نہیں سر پھٹول ہوتے) ہیں، اور جوں جوں ہم ان کے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اور پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس مجلسِ مشاورت کی روئداد سے یہ حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں کہ

۱۔ مجلس مشاورت میں سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی دیگر ارکان جیسی ہوتی ہے اور ہر رکن کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔
۲۔ مجلس مشاورت میں بحث اس نکتہ پر ہوتی ہے کہ خدا کی کتاب اس باب میں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔
۳۔ اس راہ نمائی کے سامنے آجانے کے بعد سب اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔
۴۔ فیصلہ نہ صدر کا ہوتا ہے، نہ وزیراعظم کا۔ فیصلہ کتاب اللہ کا ہوتا ہے جس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔
۵۔ اسلامی حکومت میں علماء کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا جن سے شرعی فتویٰ مانگا جائے۔ اس میں ارکانِ امت قرآن کریم کی روشنی میں خود فیصلے کرتے ہیں جنہیں حکومت، اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی روشنی میں مشاورت کا طریق، نہج اور فیصلہ کا معیار کیا ہوتا ہے؟ قرآن سے اپنی تائید میں سند پیش کرنے کا اسی کو حق حاصل ہو سکتا ہے جو پہلے اس کا اعلان کرے، اور اس کا عمل بھی اس کے اس کے مطابق ہو کہ

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

جس مملکت کی بنیاد خدا کے متعین فرمودہ اس غیر متبدل اصول پر نہ ہو، وہ حکومت اسلامی نہیں، سیکولر ہوتی ہے اور سیکولر حکومت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟ اگر روش یہ اختیار کر لی جائے کہ قرآن کا جو فیصلہ اپنے مفید مطلب ہو اسے اختیار کر لیا جائے اور دیگر معاملات غیر قرآنی رہیں، تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعید آئی ہے بڑی لرزہ انگیز ہے۔ اس نے کہا ہے:۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ (۲/۸۵)

کیا (تمہاری یہ روش ہے کہ) تم کتاب اللہ کے کسی حصہ کو تسلیم کرتے ہو اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے ہو! جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی دنیاوی زندگی ذلت و خواری کی ہو گی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔

"ضرورتِ رشتہ" لیڈی لکچرار، محکمۂ تعلیم۔ گریڈ ۱۷ مستقل ملازمت، لاہور کے لئے لکچرار (ٹیکنیکل) یا مساوی معیار کا رشتہ مطلوب ہے۔ مکمل کوائف معہ خاندانی حالات تحریر فرمائیں۔
(م ی) معرفت ادارۂ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

قرارِ دادِ مقاصد

قرار دادِ مقاصد مارچ سنہ ۱۹۴۹ء کو منظور ہوئی تھی، اس تمام عرصہ میں اس کا ذکر گاہے بگاہے ہوتا رہا، لیکن اب جو کہا گیا ہے کہ اسے آئندہ دستورِ پاکستان کا جزو بنا دیا جائے گا تو اس کا چرچا عام ہو گیا ہے اور اسی نسبت سے ہمارے ہاں استفسارات کا تانتا بندھ گیا ہے۔ مستفسرین بھی سچے ہیں۔ جو لوگ ۱۹۴۹ء میں موجود تھے ان میں سے بیشتر راہیِ ملکِ عدم ہو چکے ہیں۔ جو اس کے بعد پیدا ہوئے، اس دور کی کوئی ایسی تاریخ مرتب نہیں ہوئی جس سے انہیں مستند معلومات میسر آ سکیں۔ طلوعِ اسلام ہی ایک ادارہ ہے جس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہ قرار داد کن حالات میں منظور ہوئی تھی اور اسے منظور کرانے میں کیا کیا مقاصد پوشیدہ تھے، یہ داستان طویل ہے۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ (کالعدم) جماعتِ اسلامی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ ان کی سعی و کاوش کا نتیجہ تھی۔ ماہنامہ ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۴۹ء (صـ۴۹) میں لکھا گیا تھا۔

جماعتِ اسلامی نے باطل کے حفاظتی انتظامات کی پرواہ کئے بغیر ایک ہمہ گیر تعمیری تبدیلی کو عملاً برپا کرنے کے لئے سنہ ۱۹۴۸ء کے آغاز سے "مطالبہ نظامِ اسلامی" کی مہم کا آغاز کیا تھا، رفتہ رفتہ یہ مہم ایک منظم عوامی تحریک بن گئی اور ایک سال کی پیہم جد و جہد کے بعد دستور ساز اسمبلی کو اس نے مجبور کر دیا کہ وہ اس مطالبہ کو دستوری حیثیت سے تسلیم کرے یہاں تک کہ ۱۲ مارچ کو پاک دستور یہ نے قرار دادِ مقاصد پاس کر دی؟

یہ جماعت اپنے مطالبات منوانے کے لئے کس طرح دوسروں کو مجبور کیا کرتی ہے، یہ چھپی ہوئی حقیقت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ واضح ہے کہ یہ جماعت "اسلام" کی خاطر جو قدم بھی اٹھایا کرتی ہے اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ کوئی اپنا سیاسی مقصد پنہاں ہوتا ہے۔ یہ مقصد کیا تھا، اسے جاننے کے لئے ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔

اس جماعت نے مطالبۂ پاکستان کی جی بھر کر مخالفت کی تھی، اور ان کی مخالفت کی مہم آخری لمحات تک جاری رہی تھی۔ حتیٰ کہ جب ان کی یہ مہم مسلم اکثریت کے صوبوں میں ناکام ہو گئی تو انہوں نے اپریل ۱۹۴۷ء میں مسلم اقلیتی صوبوں کا رُخ کیا تاکہ انہیں اس مطالبہ کی مخالفت کے لئے اکسایا جائے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام قائم کیا جائے تو مودودی (مرحوم) فرماتے کہ،

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ (صـ۳۲-۱۳۱)

ان کی پیہم مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا۔ اور دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ حضرات سب سے پہلے یہاں آ دھمکے۔

مودودی (مرحوم) کی زندگی کا انتہائی مقصد حصولِ اقتدار یا حصولِ قیادت تھا۔ وہ پاکستان آئے تو اسی مقصد کو لئے ہوئے۔ لیکن یہ چیز ان کے دل میں کھٹک پیدا کر رہی تھی کہ ابھی کل تک جس مملکت کے نظام کو وہ "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت" قرار دیا کرتے تھے، اب کس منہ سے اس کے اقتدار یا قیادت کا مطالبہ کریں؟ اس اعتراض سے بچنے کے لئے انہوں نے ایک ترکیب سوچ لی اور وہ تھی قراردادِ مقاصد، چنانچہ اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد کہا گیا کہ،

> مارچ سنہ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد پاس کی جس سے آئینی طور پر اس ریاست کی حیثیت اسلامی قرار پا گئی۔ (ترجمان القرآن۔ جون سنہ ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۱۶۰)

اس طرح اس ریاست کے "مسلمان" ہو جانے کے بعد قیادت کی راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ ترجمان القرآن نے قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے تذکرہ کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ،

> یہ "مطالبہ" جس دن میدان میں آیا تھا اسی دن ایوانِ اقتدار میں یہ "خطرہ" سونگھ لیا گیا تھا کہ اس مطالبہ میں تبدیلیٔ قیادت کا مطالبہ فطرۃً مضمر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی نظام اپنے قیام و نفاذ کے لئے اسلامی ذہنیت اور اسلامی سیرت رکھنے والے کارکنوں کا محتاج ہے۔ اس وجہ سے نظامِ اسلامی کے قیام کی تحریک ازخود انقلابِ قیادت کی تحریک بھی تھی۔ (ترجمان القرآن جون۔ جولائی ۱۹۴۹ء صفحہ ۸)

چنانچہ اس کے بعد "نفاذِ اسلام" کے نام سے جو کچھ کیا گیا تھا، وہ اسی تبدیلیٔ قیادت کے لئے تھا۔ ترجمان القرآن بابت اکتوبر سنہ ۱۹۴۹ء میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی،

> قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کے بعد جب جماعتِ اسلامی نے یہ محسوس کیا کہ اس قرارداد کے تقاضوں کے مطابق ملت جن تبدیلیوں کی آرزومند ہے ان کے واقعہ ہونے میں بدقسمتی سے اربابِ اقتدار کا وہ گروہ حائل ہے جو اپنے ذہن و سیرت کی مخصوص ساخت کی وجہ سے یہ اہلیت نہیں رکھتا کہ اسلامی نظام کی امامت کا فریضہ ادا کر سکے تو جماعت نے پورے دلائل کے ساتھ انقلابِ قیادت کی دعوت کو عوام تک پہنچانے کا آغاز کر دیا۔ اب اس انقلابِ قیادت کو اسلام کے منشا کے مطابق برپا کرنے کے لئے رائے عامہ کو اسلامی اصولوں کی تربیت دینے کا جو مرحلہ سامنے آگیا ہے اس میں جماعتِ اسلامی قول و عمل سے شہادتِ حق کا فریضہ انجام دینے اٹھی ہے۔

پاکستان کی تاریخ کا ملخص یہ ہے کہ اس بدقسمت قوم نے قیادت ان حضرات کے سپرد کی۔ اس کی انہیں بھرا یہ ملی کہ ملک کو ایک شب بھی سکھ کی نیند سونا نصیب نہ ہوا۔

یہ تھا "قراردادِ مقاصد" کے پاس ہونے کا پس منظر اور اس کا مقصود و مطلوب یعنی "مملکتِ پاکستان کو مسلمان کرنا" تاکہ جماعتِ اسلامی کے لئے حصولِ اقتدار کی راہ ہموار ہو جائے۔

طلوعِ اسلام کے نہ کوئی سیاسی مقاصد ہیں، نہ ذاتی مفادات۔ اس کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جو معاملہ بھی زیرِ نظر ہو اس کا قرآنِ کریم کی روشنی میں تجزیہ کر کے بتایا جائے کہ اس میں کیا کیا قرآن کے خلاف ہے اور اس کی اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے قراردادِ مقاصد کا بھی اسی انداز سے تجزیہ کیا اور اس پر بھرپور تبصرہ کیا جو پہلے اس کی اشاعت بابت نومبر ۱۹۵

میں شائع ہوا اور اس کے بعد اس کتابچہ میں جس کا عنوان تھا، "قرآنی دستورِ پاکستان"۔ مستفسرین کے اصرار کے پیش نظر اسے باصلہ لفظی تغیّر درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

قراردادِ مقاصد کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

تمام کائنات پر (SOVEREIGNTY) صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس نے جو اختیارات ملّتِ پاکستانیہ کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو تفویض (DELEGATE) کئے ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جنہیں خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جائے گا۔

اس سے واضح ہے کہ تمام کائنات میں (SOVEREIGN POWER) صرف خدا کی ہے اور چونکہ کائنات میں پاکستان بھی شامل ہے اس لئے مملکتِ پاکستان کی (SOVEREIGN POWER) بھی خدا کی ذات ہی ہے۔

قراردادِ مقاصد کا اگلا ٹکڑا یہ ہے:۔

یہ دستور ساز اسمبلی جو ملتِ پاکستانیہ کی نمائندہ جماعت ہے، فیصلہ کرتی ہے کہ وہ پاکستان کی آزاد اور (SOVEREIGN STATE) کے لئے دستور مدون کرے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مملکتِ پاکستان ایک (SOVEREIGN STATE) ہوگی۔

کھلا ہوا تضاد

کانسٹی ٹیوشن کے نقطۂ نگاہ سے قراردادِ مقاصد کے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر دیکھئے، ان میں کھلا ہوا تضاد نظر آئے گا۔ یعنی:۔

(۱) اگر تمام کائنات کی (SOVEREIGN POWER) خدا کی ذات ہے تو مملکتِ پاکستان یا دنیا کا کوئی اور خطہ (SOVEREIGN) نہیں ہو سکتا۔

اور (ب) اگر مملکتِ پاکستان (SOVEREIGN POWER) رکھتی ہے تو پھر اس مملکت پر کسی اور کی (SOVEREIGNTY) نہیں ہو سکتی کیونکہ ایک مملکت میں ایک سے زیادہ (SOVEREIGN POWERS) ہو نہیں سکتیں۔

اور (ج) اگر یہ کہا جائے کہ حقیقی (SOVEREIGNTY) تو خدا کی ہے لیکن اس نے یہ (SOVEREIGNTY) مملکتِ پاکستان کو تفویض (DELEGATE) کر دی ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ کوئی (SOVEREIGN POWER) اپنی (SOVEREIGNTY) کسی اور کو (DELEGATE) کر کے خود (SOVEREIGN) نہیں رہ سکتی۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ محض لفظی نزاع ہے اور۔۔۔ غواص کو مطلب ہے گہر سے، نہ صدف سے، تو اول تو کانسٹی ٹیوشن میں الفاظ کا صحیح انتخاب اور ان کے معانی کا صحیح تعین نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک غلط لفظ کا انتخاب یا اس کا غلط مفہوم بڑی اہم پیچیدگیوں کا موجب بن جایا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہمارے نزدیک اس قسم کے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام میں خدا اور اسلامی مملکت کا جو باہمی تعلق ہے اسے نہایت صاف اور واضح الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ قراردادِ مقاصد کی رو سے خدا کی (SOVEREIGNTY) محض

ایک مجرّد خیال (ABSTRACT THOUGHT) کی حیثیت رکھتی ہے۔ عملی دنیا میں (SOVEREIGNTY) مملکتِ پاکستان ہی کی رہتی ہے لیکن قرآن کی رُو سے خدا اور مملکتِ اسلامیہ کا جو تعلق ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی ہیئتِ حاکمیہ اور اقتدارِ اعلیٰ ایک عملی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس میں نہ کوئی الجھاؤ ہوتا ہے نہ پیچیدگی نہ ابہام۔ یہ تعلق کیا ہے؟ اور اسے کن الفاظ میں بیان کرنا چاہیئے؟ اس کے متعلق چند سطور آگے چل کر لکھا جائے گا۔

---

(۲) قراردادِ مقاصد کے جو اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں ان میں یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جو اختیارات ملتِ پاکستانیہ کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو تفویض (DELEGATE) کئے ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیاراتِ حکومت ملتِ پاکستانیہ کو تفویض (DELEGATE) کر دیئے ہیں اور ملتِ پاکستانیہ نے انہیں مملکتِ پاکستان کے سپرد کر دیا ہے لہٰذا اب خدا کے اختیارات کی حامل مملکتِ پاکستان ہے۔

دوسری غلطی کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے جب کوئی قوت اپنے اختیارات کسی دوسرے کو تفویض (DELEGATE) کر دیتی ہے تو جب تک وہ ان اختیارات کو واپس نہ لے وہ اختیارات اس کے پاس نہیں رہتے اس سے لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جو اختیارات مملکتِ پاکستان کو تفویض (DELEGATE) کر دیئے ہیں وہ اس وقت اللہ کے پاس نہیں رہے۔ اللہ کے متعلق اس قسم کا تصور بالکل غلط ہے۔ یہ تصور عیسائیوں کے (POPES) کا پیدا کردہ ہے وہ کہتے تھے کہ خدا نے اپنے اختیارات انہیں تفویض کر دیئے ہیں لہٰذا ان کا حکم خدا کا حکم ہے اور وہ خدائی اختیارات کے مطابق انسانوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کا نام (DIVINE RIGHTS) خدائی حقوق تھا اور اس اندازِ حکومت کا نام تھیوکریسی (THEOCRACY) یہی تصور مسلمان سلاطین نے عیسائیوں سے مستعار لیا اور السلطان ظل اللہ علی الارض (بادشاہ دنیا میں خدا کا سایہ ہے) جیسی روایات وضع کر کے اپنی خدائی فوجداری کو مستند بنا بیٹھے۔ اب بھی مسلمانوں میں جہاں جہاں ملوکیت ہے وہاں سلطان کو ظل اللہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں ملوکیت نہیں اس لئے ارباب شریعت کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اسلامی نظام کے علمبردار یہی "حاملانِ شریعِ متین" ہیں کیونکہ خدا نے اپنے اختیارات انہی کو تفویض کئے ہیں اور یہی ان اختیارات کو نافذ کرنے کے اہل ہیں۔

تھیاکریسی اربابِ شریعت کی طرف سے جو مطالبہ پیش ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام ہونا چاہیئے اس کا جذبہ محرکہ اسی اقتدار کا حصول ہے اس لئے کہ اگر یہ مطالبہ منظور کر لیا جائے تو اس سے اگلا مطالبہ یہ ہوگا کہ نظامِ مملکت ہمارے سپرد کر دو کیونکہ ہم ہی بتا سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح چل سکتا ہے۔ اسی کا نام تھیاکریسی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اور جس کے احیاء کے لئے اب اس قدر شور مچایا جا رہا ہے۔ اسلام نے اس برہمنیت کو اس لئے مٹایا تھا کہ برہمنیت کا استبداد ملوکیت کے استبداد سے کم نہیں ہوا کرتا۔ جن لوگوں کی نگاہوں میں تاریخ کے وہ ادوار ہیں جب اقتدار مذہب پرست طبقہ کے ہاتھ میں تھا وہ خوب جانتے ہیں کہ ان ادوار میں انسانیت کن جاں گسل مصائب کا شکار ہوتی تھی۔

حدود اللہ قراردادِ مقاصد کے محرک محترم لیاقت علیخاں کے دل میں یہ کھٹکا پیدا ہوا تھا اس لئے انہوں نے اپنی تقریر میں اس کی وضاحت ضروری سمجھی تھی کہ پاکستان میں تھیوکریسی قائم نہیں کرنا چاہتا

لیکن جب اس تھیوکریسی کا بنیادی تصور قرارداد مقاصد میں موجود ہے (جو قرارداد اب دستور پاکستان کا جزو بننے والی ہے) تو وضاحتی تقریروں سے اس کی نفی کیسے ہو سکتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے خدا اپنے اختیارات کسی کو (DELEGATE) نہیں کیا کرتا۔ اس نے انسان کو ایک دائرے کے اندر صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہ اختیار و ارادہ خود خدا کا عطا فرمودہ ہے۔ انسان اپنے ان اختیارات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے لیکن چونکہ اس دنیا میں انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے اور اس انداز زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں کے باہمی مفاد میں تصادم ہو جس کا نتیجہ فساد فی الارض (معاشرہ کی ناہمواریوں) کی صورت میں سامنے آتا ہے اس لئے انسانی معاشرہ کو ان ناہمواریوں سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود متعین کر دی ہیں اور انسانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو جس طرح جی چاہے استعمال نہیں کر سکتے بلکہ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال ان حدود کے اندر کریں۔ یہ حدود انسانی عقل کی تراشیدہ نہیں ہیں نہ ہی انسانی عقل ان کو متعین کر سکتی تھی۔ یہ وحی کے ذریعے خدا کی طرف سے متعین کردہ حدود ہیں جو قرآن کریم کے اندر واضح طور پر مکتوب و محفوظ ہیں۔ یہ حدود ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ ان کا نام حدود اللہ یا ضابطۂ قوانینِ خداوندی (الکتاب) ہے۔ ان حدود کا اعجاز یہ ہے کہ ان کے اندر استعمال کردہ انسانی اختیارات سے باہمی مفاد میں تصادم پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ اختیارات تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس ربوبیت سے مراد صرف جسم انسانی کی طبعی پرورش ہی نہیں ہوتی۔ اس سے مقصود جوہر انسانیت یا انسانیت کی مضمر صلاحیتوں (HUMAN POTENTIALITIES) کی نشوونما ہوتا ہے۔ دنیا میں جو قوم اپنے اختیارات کو ان حدود و قیود کے ماتحت استعمال کرتی ہے وہ اسلامی مملکت کی علمبردار کہلاتی ہے اور جو جماعت اپنے اختیارات کو ان حدود و قیود کے مطابق استعمال نہیں کرتی بلکہ اپنی مصلحت کوشیوں کے تحت صرف کرتی ہے وہ طاغوتی مملکت کہلاتی ہے۔ قرارداد مقاصد میں یہ موجود ہے کہ خدا کے ان مفوضہ اختیارات کو ان حدود کے اندر استعمال کیا جائے گا جو اس نے متعین کی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے "تفویض" (DELEGATION) کا تصور غیر قرآنی ہے۔ خدا کی طرف سے عائد کردہ حدبندی ان اختیارات پر ہے جو انسان کو بشریت کے دائرہ کے اندر خود حاصل ہیں۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ وہ انسانی اختیارات کے استعمال کی حدبندی کرتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ بحث کا یہ حصہ بھی محض لفظی نزاع نہیں بلکہ ایک اہم اصولی بحث ہے اور اس بنیادی غلطی کا ازالہ جو قرارداد مقاصد میں موجود ہے۔[1]

تیسری غلطی

قرارداد مقاصد میں یہ لکھا ہے کہ خدا نے اپنے اختیارات ملت (PEOPLE) کی وساطت سے مملکت کو عطا کئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اختیارات کی حامل مملکت ہے، ملت نہیں۔ کسی نظامِ مملکت میں ملت اور مملکت (PEOPLE AND THE STATE) کے کیا تعلقات ہیں؟ یہ بحث ایک زمانہ سے علمائے سیاست کی بحث و تمحیص کا مرکز بنے چلی آ رہی ہے۔ مغربی مفکرین میں سے میکیاولی، لاک، روسو، ہابز

[1] طلوع اسلام کی بار بار وضاحت پر یہ الفاظ ۱۹۷۳ء کے آئین سے حذف کر دیئے گئے (۱۹۸۳ء)

بینیتھم ہل وغیرہ نے اس مسئلہ پر بڑی لمبی چوڑی بحث کی ہے ہمیں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مسلک مطالعۂ قرآن کی رُو سے اسلام میں ملّت اور مملکت الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ملّت ایک انتظامی مشینری متعین کرتی ہے جو خود ملّت ہی کا ایک جزو ہوتی ہے۔ ملّت اپنے اختیارات اس انتظامی مشینری کو تفویض نہیں کر دیتی۔ اختیارات ملّت ہی کے ہوتے ہیں فقط ان کا استعمال اس مشینری کی وساطت سے ہوتا ہے۔ قرآن کی رُو سے اصل بحث ملّت اور مملکت کی نہیں بلکہ فرد اور ملّت کے باہمی تعلق کی ہوتی ہے۔

فرد اور ملّت

فرد (INDIVIDUAL) اور مملکت (STATE) کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے متعلق بھی مغرب کے علمائے سیاست نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہمیں اس بحث سے بھی سر دست واسطہ نہیں۔ قرآن کی رُو سے ملّت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فرد کی مضمر صلاحیتوں کی تکمیل کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع بہم پہنچائے۔ (اسی کو نظامِ ربوبیت کہتے ہیں) اور فرد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی استعداد کا ماحصل ملّت کے سپرد کر دے تاکہ اس سے یہ نظامِ ربوبیت قائم رہے۔ واضح رہے کہ یہ نظامِ ربوبیت تمام نوعِ انسانی کو محیط ہوتا ہے یعنی اس کی ابتداء اگرچہ ایک متعین جماعت اور مخصوص دائرے سے ہوتی ہے لیکن یہ دائرہ پھیلتے پھیلتے تمام دنیا کو اپنے احاطہ کے اندر لے آتا ہے۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر یہ کہنا غلط ہے کہ اسلامی نظام میں ملّت اپنے اختیارات مملکت کو تفویض کر دیتی ہے۔ اس لئے قرار دادِ مقاصد کی یہ شق بھی ترمیم طلب ہے۔

چوتھی غلطی

قرار دادِ مقاصد میں لکھا ہے کہ نظامِ حکومت جمہوریت کے اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے گا۔ ہم جب یہ کہیں گے کہ اس قسم کا مطلق اصول بھی غیر اسلامی ہے تو یہ سُن کر آپ یقیناً بے حد متعجب ہوں گے اس لئے کہ آپ کے ذہن میں یہ ہو گا کہ خیر اور باتوں کو تو چھوڑیئے۔ اس حقیقت میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور اسلام ہی نے دنیا کو جمہوریت سکھائی تھی۔

جمہوریت اور اسلام

لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسلام اس معنی میں جمہوری نظام نہیں جس معنی میں اس اصطلاح کو مغرب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں (قرنِ اوّل کو چھوڑ کر) شخصی حکومتوں کا دور رہا۔۔۔ اور آج بھی مسلمانوں کی حکومتیں عام طور پر شخصی ملوکیتوں کی حکومتیں ہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے شخصی ملوکیتیں (TOTALITARIAN STATES) ظلم و استبداد کا مجسمہ ہوتی ہیں اس لئے مسلمانوں کی حکومتیں بھی بالعموم اس قسم کی تھیں اور ہیں۔ جب یورپ نے اپنے ہاں آئینی جمہوریت نافذ کیا تو چونکہ یہ آئینی شخصی حکومتوں کے مقابلہ میں بہتر تھا۔ اس لئے دنیا نے اس نظام کو "نعمتِ خداوندی" سمجھ کر اسے سر آنکھوں پر اٹھایا۔ مسلمانوں نے بھی یہ سمجھ لیا کہ نظامِ حکومت دو ہی طرح کا ہو سکتا ہے۔ یا شخصی ملوکیت یا جمہوری نظام۔ شخصی ملوکیت یقیناً ایک رجعت پسندانہ (REACTIONARY) مسلک تھا اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو ترقی پسند (PROGRESSIVE) ظاہر کرنے کے لئے مغرب کی ہم آہنگی میں فوراً اعلان کر دیا کہ اسلام جمہوری نظامِ حکومت سکھاتا ہے اور یہ نہ سوچا کہ مغرب کس چیز کو جمہوری نظام کہتا ہے اور وہ جمہوری نظام کا وہ تصور جو مغرب میں

رائج ہے اسلامی ہو بھی سکتا ہے یا نہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نہ ملوکیت سکھاتا ہے اور نہ مغرب کے جمہوری نظام کا حامل ہے، وہ ان سے الگ ایک اور نظامِ حکومت کا حامل ہے اور اسی نظامِ حکومت میں نوعِ انسانی کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

ڈیماکریٹک نظامِ حکومت کسے کہتے ہیں ؟ دو لفظوں میں یہ کہ جس بات کو ۵۱ میں اکیاون صحیح کہہ دیں اسے صحیح تسلیم کیا جائے۔ نظامِ جمہوریت کی رُو سے کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے خارجی مستقل معیار کوئی نہیں ہوتا۔ غلط اور صحیح (RIGHT AND WRONG) کا معیار آراء کی تعداد ہوتی ہے۔ اگر کبھی اکیاون ۵۱ ہاتھ اس بات کی تائید میں اٹھ جائیں کہ دنیا میں خدا کا وجود کوئی نہیں تو باقی انچاس ۴۹ کو یہ فیصلہ بطور حقیقت تسلیم کرنا ہوگا اور یہی فیصلہ صحیح فیصلہ قرار پا جائے گا۔ اس اصول کے تحت دنیا میں نہ کوئی چیز حقِ مطلق (ABSOLUTE RIGHT) ہوتی ہے نہ کوئی شئے اپنی ذات میں مطلق باطل (ABSOLUTE WRONG) جب امریکہ کی پارلیمنٹ نے کثرتِ رائے سے یہ فیصلہ کر دیا کہ شراب ناجائز ہے تو وہ ناجائز قرار پا گئی۔ اور اس کا استعمال جرم۔ اور جب دوسری مرتبہ وہاں کی آراء کی کثرت اس طرف چلی گئی کہ شراب جائز ہے تو شراب جائز قرار پا گئی اور اس کا استعمال کوئی جرم نہ رہا۔ یہ ہے نظامِ جمہوریت یعنی ڈیموکریسی۔

مستقل معیار

آپ خود ہی سوچئے کہ کیا اس قسم کا نظام اسلامی نظام کہلا سکتا ہے ؟ اسلامی تو ایک طرف اسے تو انسانی نظام کہنا بھی انسانیت کی ہتک ہے۔ اسلام حق اور باطل کے لئے خارجی مستقل اور مطلق معیار مقرر کرتا ہے جس چیز کو اس معیار نے صحیح قرار دیا ہے وہ صحیح رہے گی خواہ سو فیصد انسان اس کے غلط ہونے کے لئے رائے دے دیں۔ جو اس کے مطابق غلط ہے، وہ غلط رہے گی۔ خواہ اس کے غلط قرار دینے کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے۔ قرآن کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے اگر وہ لوگوں کے خیالات کے تابع ہو جائے تو کائنات میں فساد ہی فساد رونما ہو جائے۔ انسانی معاشرہ میں یہ سارا فساد اسی لئے برپا ہو رہا ہے کہ حق و باطل کا فیصلہ انسانوں کی آراء کے تحت کیا جاتا ہے۔ حق وہ ہے جسے اکیاون ۵۱ حق کہہ دیں باطل وہ جسے اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ وہ چیز اپنی ذات میں صحیح ہے یا غلط۔ فیصلہ صرف اس معیار پر ہوگا کہ اس کی تائید میں کتنے ہاتھ اٹھتے ہیں۔ یورپ کے پاس حق اور باطل کا کوئی مستقل اور مطلق معیار نہ تھا۔ اس لئے جب اہلِ مغرب شخصی حکومتوں کے استبداد سے گھبرائے تو ان کو اس کے سوا اور کچھ سوجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا کوئی ردِ عمل تلاش کریں۔ اور ردِ عمل یہی ہو سکتا تھا کہ ایک ہی رائے کی حکومت قبول کرنے کی بجائے اکثریت کی حکومت قبول کی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے ان کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا لیکن ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے یعنی اکثریت کا فیصلہ حق ہوتا ہے یہ قطعاً غلط ہے۔

حق، حق ہے خواہ اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے انسانی انقلاب کے سب سے بڑے داعی حضور ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی حق پر تھے جب انہوں نے پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی تھی کہ آؤ میں تمہیں حق کی دعوت دیتا ہوں حالانکہ اس وقت اس "ریزولیوشن" کا "سیکنڈ" کرنے والا بھی کوئی نہ تھا اور جب دو تین "سیکنڈ" کرنے والے ملے بھی تو گویا پوری کی پوری آبادی اس کے خلاف تھی، اگر اسلام مغرب کے مفہوم کے اعتبار سے جمہوری نظام ہوتا تو اس اقل قلیل اقلیت

کو اپنا "ریزولیوشن" واپس لے لینا پڑتا اور حق وہی قرار پا جاتا جس کی تائید قریش کے کفار کی اکثریت کر رہی تھی۔

اسلامی نظام

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے قرآن نے ایسے اصول متعین کر دیئے ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں یہ اصول اسلامی معاشرہ کے تمام بنیادی خطوط کو متعین کر دیتے ہیں اس لئے ان اصولوں کے متعلق یہ تصور ہی غلط ہے کہ ان کے صحیح اور جائز ہونے کے لئے بھی آراء شماری کی جائے گی اس بناء پر اسلامی نظام کا یہ بنیادی حصہ جمہوری یا غیر جمہوری تصورات سے یکسر الگ اور بلند ہے۔

البتہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانہ کی ملتِ اسلامیہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی اور ان قوانین کی تنفیذ کے لئے ایک مشینری وضع کرے گی۔۔۔ یہ وہ امور ہیں جن کے لئے قرآن باہمی مشاورت کا حکم دیتا ہے لہٰذا اس حد تک اسلام ایک مشاورتی نظام ہے۔

اس باہمی مشاورت کے لئے عملی طریق کار کیا ہوگا اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں جب ہم اسلامی دستور کے خطوط و خال سے بحث کریں گے تو یہ سوالات خود بخود سامنے آجائیں گے اور وہی مقام ان کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہوگا اس وقت ہم صرف اصولی بحث کر رہے ہیں۔

یہاں ضمناً اتنا بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ جس اسلامی نظام کا مطالبہ مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ نظام نہ اسلامی ہے اور نہ ہی قابلِ عمل تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ مولوی صاحبان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ایک ایک نقل و حرکت کے لئے تمام فیصلے پہلے ہو چکے ہیں اور ان فیصلوں میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا یہ تمام جزئی فیصلے من و عن نافذ کرنے ہوں گے اور اس میں یہ سوچنے کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی کہ یہ جزئیات اس زمانے میں جب کہ دنیا کچھ سے کچھ ہو چکی ہے قابلِ عمل ہیں بھی یا نہیں ان کے نزدیک یہ ناقابلِ تغیر فیصلے روایات اور فقہ کی کتابوں میں مندرج ہیں۔

قرآن کی رُو سے اسلامی نظام سے مفہوم یہ ہرگز نہیں جیسا کہ کہا جا چکا ہے قرآن کے نزدیک ناقابلِ تغیر صرف وہ اصول ہیں جو اس نظام کی چار دیواری (BOUNDRY LINES) بنتے ہیں ان کے اندر جزئی قوانین خود مرتب کئے جائیں گے اور ان کی ترتیب میں وہ قوانین بطور نظائر کام دیں گے جو کسی اسلامی حکومت نے اس سے پیشتر مرتب کئے تھے۔ ان میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ علیٰ حالہٖ رکھے جائیں گے باقی قوانین میں اپنی ضرورت کے مطابق تبدیلی کر لی جائے گی۔ (اس موضوع پر ذرا آگے چل کر مزید روشنی ڈالی جائے گی)

یہ اصول ہوں یا ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات ان سب کا اطلاق مملکتِ اسلامیہ کے ہر فرد پر یکساں ہوگا۔

پانچویں غلطی

قرار دادِ مقاصد میں یہ بھی درج ہے کہ اختیارات باشندگانِ پاکستان (PEOPLE OF PAKISTAN) کو حاصل ہیں اور باشندگانِ پاکستان ہی کی نمائندہ جماعت ان اختیارات کو جمہوری انداز سے استعمال کرے گی یہ ظاہر ہے کہ باشندگانِ پاکستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں اس لئے قرار دادِ مقاصد کی رو سے

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات پاکستان کے مسلمانوں، ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں حتیٰ کہ دہریوں تک سب کو تفویض (DELEGATE) کر دیئے ہیں۔

(۲) اور یہ سب باشندے جمہوری انداز سے ان خدائی اختیارات کو استعمال کریں گے بظاہر یہ چیز بڑی خوش آئند نظر آتی ہے

اور مسلمانوں کی فراخ حوصلگی کشادہ نگہی اور "مذہبی رواداری" کی روشن دلیل بن کر دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ چیز اسلام کے خلاف ہے۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہماری نگاہ پھر اس تبسّم زیرلبی پر ہے جو اس وقت آپ کے دل کے خیالات کی غمازی کر رہا ہے۔ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ تو بڑی کٹر ملائیت ہے، اس روشن خیالی کے زمانہ میں نظامِ مملکت کو صرف اپنی جماعت تک محدود رکھنا اور غیر مسلموں کو اس میں شریک نہ کرنا بڑی تنگ نظری اور رجعت پسندی ہے۔

اپنی بات کہنے سے پہلے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ اپنی دلیل میں جماعت کی جگہ پارٹی کا انگریزی لفظ استعمال کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہی تنگ نظری اور رجعت پسندی کس طرح دورِ حاضرہ کی وسیع النظری بن جاتی ہے۔ پارٹی گورنمنٹ آج نظامِ جمہوریت (DEMOCRECY) کا بنیادی اصول ہے۔

مسلم و غیر مسلم

قرآن مملکت کی بنیاد آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) پر رکھتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دو متضاد آئیڈیالوجی (IDEOLOGIES) رکھنے والی پارٹیاں کسی صورت میں بھی مشترکہ حکومت نہیں بنا سکتیں۔ آئیڈیالوجی اپنے حریف و مخالف کو کبھی اپنے نظام میں شریک نہیں کر سکتی۔ مملکتی نظام باہمی تعاون بلکہ اشتراک سے چلتا ہے۔ یعنی اس کے افراد کی کامل یک نگہی اور ہم آہنگی سے۔ ان سب کا منتہائے نگاہ ایک ہوتا ہے، ان کی زندگی کا مقصد واحد ہوتا ہے، ان کی فکر و نظر کا محور ایک ہوتا ہے، ان کی سعی و عمل کا مرکز ایک ہوتا ہے۔ وہ سب کے سب اپنا رُخ ایک ہی طرف رکھتے ہیں، ایک ہی آواز پہ اٹھتے ہیں۔ اور ایک ہی آواز پہ جھکتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان کے اندر کوئی متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والا عنصر آ جائے تو یہ نظام جو اسی ہم آہنگی پر قائم ہوتا ہے کبھی آگے نہیں چل سکتا۔ یہ ہے وہ وجہ جس کے لئے قرآن کریم نے بار بار تاکید کی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کسی غیر مسلم کو اپنا رازدار نہ بنائے اور یہ ظاہر ہے کہ جسے آپ اپنے رازوں میں شریک نہیں کر سکتے اسے اپنے نظامِ مملکت میں کبھی دخیل نہیں ہونے دے سکتے۔ اسلام غیر مسلموں سے انسانیت کی سطح پر عدل و انصاف کا برتاؤ کرتا ہے۔ ان سے اس قسم کا سلوک روا رکھتا ہے کہ انہیں اپنوں کے ہاں بھی شاید وہ کچھ میسر نہ آسکے۔ (تفصیل ان امور کی "بنیادی حقوق" کے باب میں بیان کی جائے گی) لیکن عدل و انصاف اور مروّت و مراعات اور چیز ہے اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک کر لینا اور چیز۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ چیز کسی تعصب یا تنگ نظری کی بناء پر نہیں بلکہ آئیڈیالوجی پہ مبنی مملکت کے لئے یہ چیز ہے ہی ناگزیر۔ اسلام ایک ایسی انقلابی آئیڈیالوجی کا حامل ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری آئیڈیالوجی منطبق نہیں ہو سکتی اس لئے اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کو شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ فنی امور میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن وہ بھی شریکِ راز کئے بغیر۔

ان حقائق کی روشنی میں قرار دادِ مقاصد کی یہ شق اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ جس میں یہ تخصیص کہیں نہیں کی گئی کہ پاکستان کا نظامِ مملکت صرف مسلمانوں پر مشتمل ہوگا، یکسر غیر اسلامی ہے۔

چھٹی غلطی

قرار دادِ مقاصد کی اگلی شق یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت فیڈریشن کے انداز کی ہوگی۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں فیڈریشن ہی کی سفارش کی ہے۔ فیڈرل حکومت کے معنی یہ ہیں کہ مختلف صوبے جنہیں اس حکومت کے یونٹ کہا جائے گا، اپنی اپنی جگہ آزاد ہوں گے، البتہ اقتدار (SOVEREIGNTY) ایک ہوگی اور فیڈرل گورنمنٹ

کے اختیارات اپنی شقوں تک محدود ہوں گے جو کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے فیڈرل لسٹ میں شامل ہوں گے مغرب کے سیاسی مدبرین نے اس انداز حکومت کے متعلق کیا کچھ لکھا ہے اور وہاں کا تجربہ کیا ہے؟ ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے ہم دیکھنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ اندازِ حکومت کیسا ہے؟

وحدتِ ملت جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اسلام کا منتہائے نگاہ انسانیت کی وحدت ہے اس کے نزدیک دنیا میں انسانوں کی صرف دو جماعتیں ہیں ایک وہ جو اپنا معاشرہ اسلامی آئیڈیالوجی کے مطابق قائم کرنا چاہیں اور دوسرے وہ جو کسی دوسری آئیڈیالوجی کے تحت معاشرتی نظام قائم کریں۔ اسی تمیز کو مسلم اور کافر کی تقسیم کہا گیا ہے۔ اور یہی وہ معیار ہے جس کی رُو سے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد بنتے ہیں۔ اسلام کی رُو سے انسانوں کی تقسیم کے اور سب معیار غلط ہیں۔ اسلام اس وحدتِ انسانیت کے لئے ملتِ اسلامیہ کو (یعنی ان تمام افرادِ انسانیہ کو جو اسلام کا معاشرتی نظام قائم کرنا چاہیں) ایک مملکت کے افراد قرار دیتا ہے اور اس مملکت میں تقسیم اور تفریق کے دیگر معیاروں کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہر وہ نظام جو ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو کمزور کرے غیر اسلامی ہوگا۔

فیڈرل حکومت تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ہمارا جداگانہ قومیت کا مطالبہ اسی بنیاد پر تھا۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ جداگانہ قومیت صرف ان صوبوں کے مسلمانوں سے مرتب ہے جن میں اس زمانے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جنہیں ایک جداگانہ مملکت بنانے کا ہمارا مطالبہ تھا ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان خواہ وہ کسی صوبے میں رہتے ہوں ایک قوم کے افراد ہیں۔ صوبائی تقسیم اس وحدتِ قومیت کو کبھی توڑ نہیں سکتی لیکن پاکستان بننے کے بعد ہماری صوبائی عصبیتیں اس قدر متشدد اور ایسی متغلب ہوگئی ہیں کہ ہر صوبے کے مسلمان عملی طور پر اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم سمجھنے لگ گئے ہیں پھر ان مختلف صوبجاتی مسلمانوں میں ایسی رقابت پائی جاتی ہے جو اکثر اوقات عداوت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ صوبائی تعصب کوئی نیا انکشاف نہیں تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک سب اسی کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے بھی سنا گیا ہے کہ ہمیں ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں وہ کچھ دیکھنا نہیں پڑا جو یہاں خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے صوبائی تعصب کے ماتحت دیکھنا پڑا ہے اسی بنا پر ہم نے بہت پہلے یہ تجویز پیش کی تھی کہ صوبوں کے موجودہ غیر نظری حدود و قیود کو مٹا دیا جائے۔ ملک میں صرف ایک حکومت رکھی جائے اور انتظامی سہولت کی غرض سے اسے مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے جن میں وقتاً فوقتاً ردّوبدل ہوتا رہے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ ہمارے اسباب بست و کشاد بجائے اس کے کہ ایسے طریقے استعمال کریں جن سے صوبائی عصبیت کمزور ہوتے ہوتے ایک دن ختم ہو جائے وہ الٹے ایسے طریقے اختیار کر رہے ہیں جن سے اس عصبیت کی گرہیں اور بھی مضبوطی سے بندھ جائیں اور تعصب بالائے تعصب کہ یہ لوگ یہ کچھ بھی کرتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ روتے بھی جاتے ہیں کہ ہمیں صوبائی عصبیت نے تباہ کر دیا ہے چنانچہ فیڈرل انداز کی حکومت اس غیر اسلامی صوبائی عصبیت کو مضبوط تر بنانے کا ایک مستقل ذریعہ ہے یہ انداز اسلام کے مزاج کے یکسر خلاف ہے مسلمانوں کے مختلف ملکوں میں اس وقت قومی حکومتیں قائم ہیں جو اسلامی وحدت کے منافی ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم مسلمان باوجود اس قدر کثرتِ آبادی کے اور باوجود اس کے کہ ہماری (STRATEGICAL) پوزیشن بڑی اہمیت رکھتی ہے دنیا میں ذلت اور خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اسلام کا منشا ان قومی حکومتوں کو مٹا کر تمام ملتِ اسلامیہ کی واحد حکومت قائم کرنا ہے۔ ان حکومتوں پر تو ہمیں اختیار نہیں لیکن پاکستان کے اندر تو ہمیں اختیار ہے مگر اس شومئی قسمت کا کیا علاج کہ ہم اس اختیار کو بھی اپنے خلاف استعمال کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اسلام نے جو جغرافیائی قومیتوں کو لعنت اور اس کی جگہ اشتراکِ دین کو قومیت کا معیار قرار دیا ہے تو اس سے مقصود شاعری نہیں جغرافیائی یا نسلی قومیتیں زندگی کے بڑے بڑے تضاد پیدا کرتی ہیں اور یہ تضادات اسی صورت میں مٹ سکتے ہیں کہ آپ ان خطوط و حدود کو مٹا دیں جو اس طرح انسانوں کو دوسرے انسانوں سے الگ کر دیتی ہیں اور دین کو معیارِ وحدت قرار دیں۔ جغرافیائی حدود جو کچھ ملکوں کے بارے میں کرتی ہیں وہی کچھ ایک ملک کے اندر مختلف صوبائی خطوط کرتے ہیں۔ صوبائی خطوط (ذہنِ انسانی کے) اور ہمارے سلسلہ میں انگریزوں کی انتظامی مصلحتوں کے) وضع کردہ خطوط ہیں لیکن یقیناً ایک صوبے میں بسنے والے انسان اپنے اندر اسی قسم کا جذبۂ علیحدگی اور مغائرت پیدا کر لیتے ہیں جو جذبہ ایک قوم کو دوسری قوم سے جدا کرتا ہے۔ پاکستان میں فیڈرل انداز کی حکومت سے یہ صوبائی قومیتیں آہستہ آہستہ مستحکم ہو جائیں گی۔ اور اس چھوٹے سے خطۂ زمین میں بھی مسلمانوں کی وحدت قائم نہ ہو سکے گی۔ چہ جائے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں وحدت قائم ہو جائے جو اسلام کا منشا ہے۔

لہٰذا ہمارے نزدیک فیڈرل انداز حکومت اسلام کے مزاج کے خلاف ہے اور وحدانی (UNITARY) انداز حکومت اس سے قریب

یہ تبصرہ ہم نے اُس قرار دادِ مقاصد پر کیا تھا جو ۱۹۴۹ء میں پاس ہوئی تھی۔ اس کے بعد، مختلف ادوار میں، دستور سازی کے سلسلہ میں یہ بحث و نزاع کا موضوع رہی اور بالآخر ایک تبدیل شدہ شکل میں ۱۹۷۳ء کے دستور میں شامل کر لی گئی۔ ہم نے اس دستور پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا تھا۔

زیرِ نظر تبصرہ سے ایک بنیادی حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی۔ یہ تبصرہ ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا تھا یعنی آج سے تینتیس سال پہلے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اصولی طور پر جو کچھ طلوعِ اسلام نے اس وقت کہا تھا (بلکہ جو کہ اس نے ۱۹۳۸ء میں کہا تھا) اور جو کچھ وہ اس کے بعد آج تک کہتا چلا آ رہا ہے۔ ان میں سرِ مُو فرق نہیں۔ یہ اس لئے کہ طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں کہتا ہے اور قرآنِ کریم کا بنیادی دعویٰ ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف یا تضاد نہیں۔ لہٰذا جو قلم بھی قرآن کریم کے حوالے سے کچھ لکھے گا اس میں قطعاً اختلاف یا تضاد نہیں ہوگا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کے کسی مقام کے سمجھنے میں کسی وقت کچھ سہو یا خطا ہو جائے لیکن جب اس پر قرآنِ کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں غور کیا جائے گا تو اس کی اصلاح بھی ہو جائیگی۔ طلوعِ اسلام پر مبدءِ فیض کا کرم ہے کہ اس نے اسے یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ معاملات زیرِ نظر کو قرآنِ خالص کی روشنی میں سمجھے اور پھر اسے پوری جرأت اور بیباکی سے پیش کر دے۔ اس لئے کہ اس نے اپنے آپ کو آج تک کسی انسانی ہاتھ سے وابستہ نہیں کیا۔ ہم اُس کی اس عنایتِ بے پایاں پر جس قدر سجدہ ہائے شکر بھی ادا کریں کم ہیں، اور آرزومند ہیں کہ جس طرح وہ اس روش پر ۱۹۳۸ء سے آج تک گامزن رہا ہے مستقبل میں بھی اس کی توفیق اسی طرح اس کے شاملِ حال رہے۔

۱؎ مشرقی پاکستان کا انجام اسی کا نتیجہ تھا (۱۹۸۳ء)